قرآنِ حکیم اور لاشعور

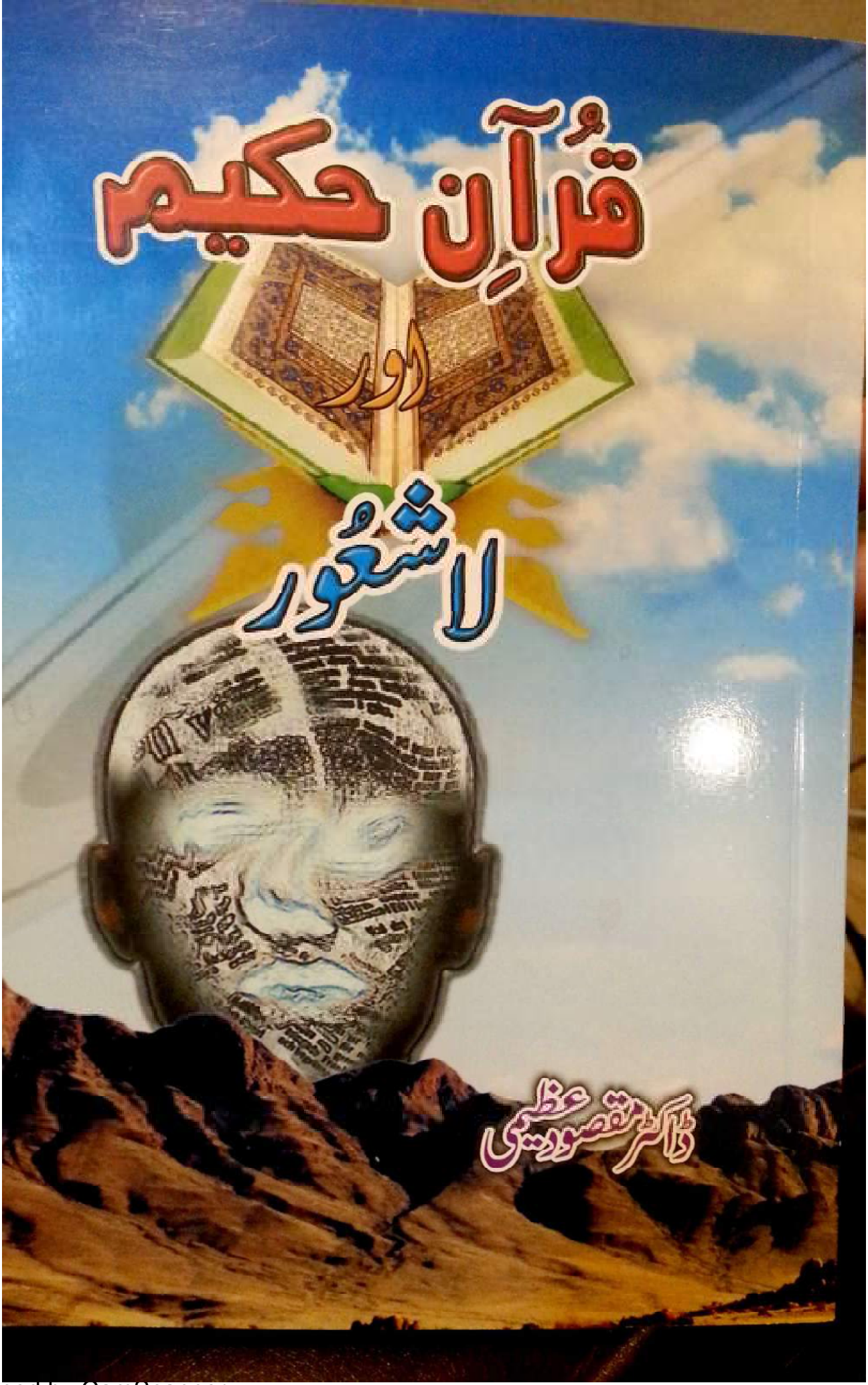

ڈاکٹر مقصود عظیمی

Scanned by CamScanner

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن حکیم

اور

لاشعور

ڈاکٹر مقصود عظیمی

Scanned by CamScanner

اس کتاب کا کوئی حصہ یا پوری کتاب کوئی بھی علم دوست، قرآن فہمی کی ترویج
کے لئے مصنف یا پبلشرز کی اجازت کے بغیر بھی شائع کر سکتا ہے۔

نام کتاب: قرآن حکیم اور لاشعور

مصنف: ڈاکٹر مقصود عظیمی

سال اشاعت: نومبر ۲۰۱۵ء

تعداد: ۱۰۰۰

کمپوزنگ: ماورا مقصود

پرنٹرز: گلیکسی گرافکس، 2680 لالہ ایوب لین پشاور صدر
فون: 091-5276568 موبائل: 0333-9303787

پبلشرز: برخیاء ایجوکیشن فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ) 2680 لالہ ایوب لین
پشاور صدر فون: 091-5272423

قیمت: 300.00 روپے

Scanned by CamScanner

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَقَالَ الرَّسُوْلُ

يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا

هٰذَا الْقُرْاٰنَ

مَهْجُوْرًا

اور پیغمبرؐ کہیں گے،
اے پروردگار میری قوم نے
اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

Scanned by CamScanner

انتساب

قرآن حکیم فرقان مجید میں مستور ازلی اور ابدی حقیقتوں
کو سمجھنے کی خواہش رکھنے
اور
اس خواہش کی تکمیل میں کوشاں رہنے والوں
کے نام

Scanned by CamScanner

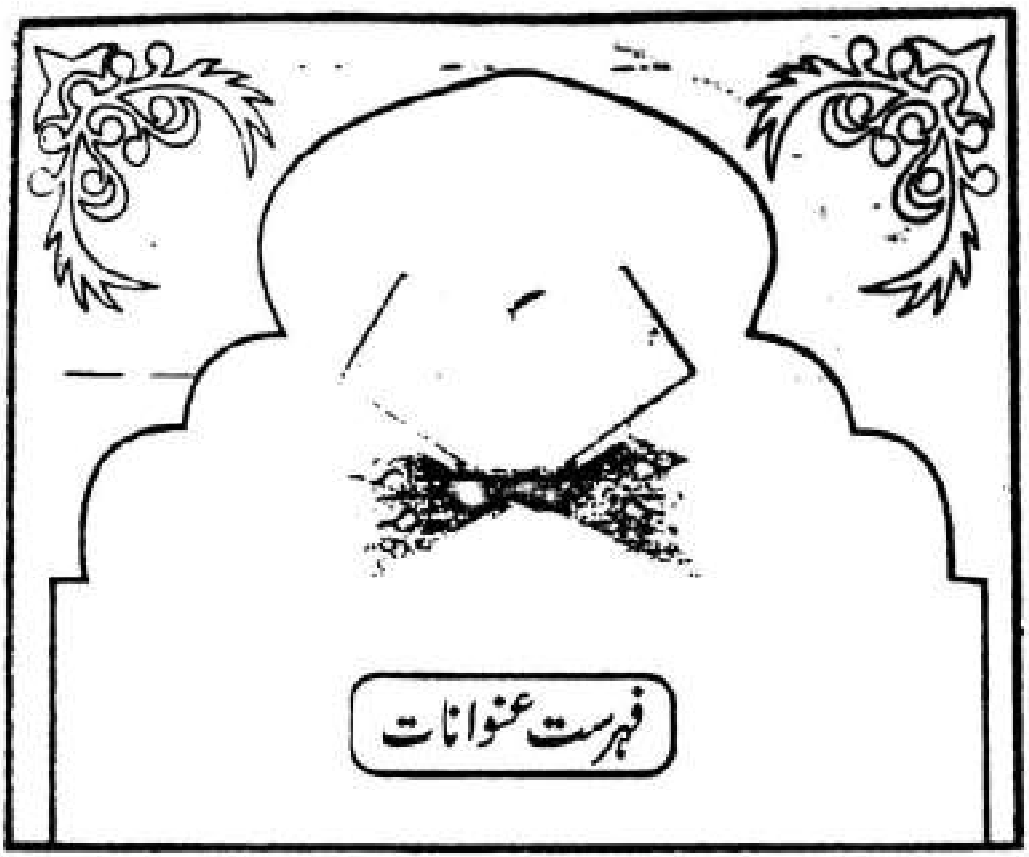

فہرست عنوانات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱.	دیباچہ	9
۲.	حرفِ اوّل	19
۳.	کلمہ گو مسلمان	27
۴.	لَا رَیْبَ فِیْہِ	35
۵.	اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم	45
۶.	فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ	53
۷.	بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم	63
۸.	غور و فکر کے چند انداز	71
۹.	یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ	79
۱۰.	لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ	87
۱۱.	وَمَآ اَدْرٰکَ	93

Scanned by CamScanner

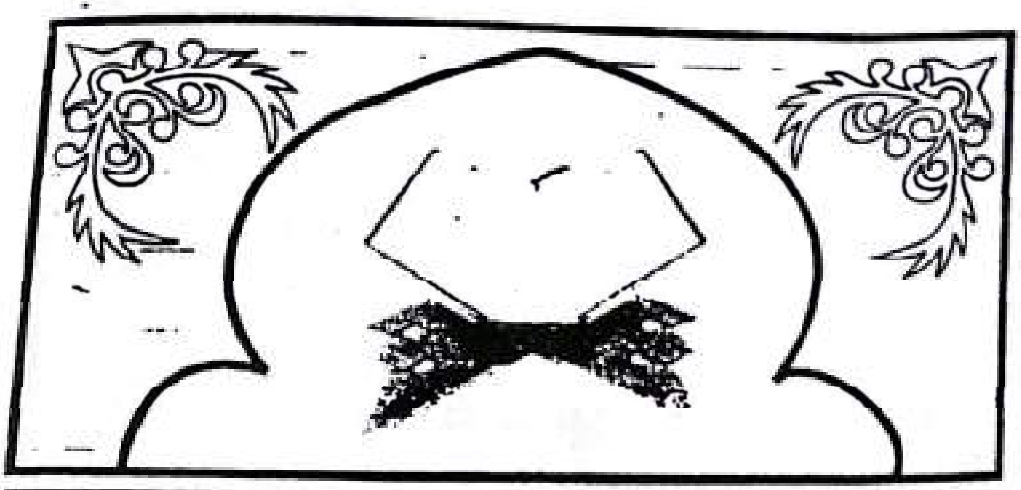

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۲	لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْن	99
۱۳	قَصَصُ الْاَنْبِيَاء	109
۱۴	اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰه	125
۱۵	خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ	133
۱۶	قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى	139
۱۷	مَتَاعٌ اِلٰى حِيْن	147
۱۸	خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ هِم...	155
۱۹	جبر و قدر	161
۲۰	اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ	169
۲۱	قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ	179
۲۲	فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُم	187
۲۳	اصحٰب الیمین	193
۲۴	الدخان	203
۲۵	وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَار	209
۲۶	وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغ	215

Scanned by CamScanner

دیباچہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

"بے شک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور تمہاری پیدائش میں بھی اور جانوروں میں بھی، جن کو وہ پھیلاتا ہے، یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں"۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

"اے دیکھنے والے! کیا تو رحمان کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ بھلا تجھے کوئی شگاف نظر آتا ہے۔ پھر دوبارہ نظر کر۔ تیری نظر ہر بار تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔ (سورۃ الملک)

"اور وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو نور بنایا اور چاند کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں اور کاموں کا حساب معلوم کرو۔ یہ سب کچھ خدا نے تدبیر سے پیدا کیا ہے۔ سمجھنے والوں کے لئے وہ اپنی آیتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔"

(سورۃ یونس)

Scanned by CamScanner

مطالعہ کائنات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن میں وضو، نماز، صوم، حج، طلاق وغیرہ پر ڈیڑھ سو آیات ہیں..... جبکہ تسخیری فارمولوں اور مطالعہ کائنات کے متعلق سات سو چھپن آیات ہیں، قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔ لیکن مسلمان نے اس کتاب کو محض آفات و بلیات سے نجات کا ذریعہ سمجھ لیا ہے اور اس کتاب کے اندر دیئے گئے تسخیری فارمولوں اور کائناتی اسرار و رموز سے محروم ہو گیا۔ اللہ کے محبوب، باعثِ تخلیقِ کائنات حضرت محمد رسول ﷺ نے فرمایا۔ 'کائنات میں گھڑی بھر کا تفکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔'

تسخیر کائنات سے متعلق قرآنی آیتوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ کائنات کے بنانے والے نے حکم دیا ہے کہ انسان تخلیقِ کائنات کے قوانین کا اس انہماک اور غور سے مطالعہ کرے کہ ہر چیز کی کاریگری سامنے آ جائے۔ تخلیقی فارمولوں پر غور کرنے والا طالب علم جب انہماک کے نقطہ عروج میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر ایسے علوم منکشف ہوتے ہیں کہ جن علوم کی ابتداء لامحدودیت سے ہوتی ہے اور ایسے طالب علم کا علم صرف کتابوں تک محدود نہیں رہتا۔ وہ اسلاف کی بنائی ہوئی دہلیز پر بیٹھا، مکان کی اینٹیں شمار نہیں کرتا رہتا بلکہ تدبر اور تفکر کی کسوٹی پر مشاہدہ اور تجزیہ کر کے یہ جان لیتا ہے کہ فضائے بسیط میں گیسوں کا آمیزہ زمین کو زندگی بخشتا ہے۔ بارش اور ہواؤں کا انتظام، کاربن، آکسیجن وغیرہ کا مشاہدہ اس کے لئے عام بات بن جاتی ہے۔ وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ کرۂ ارض کا حجم مناسب اور معین مقداروں پر قائم ہے۔

کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے مظاہر کے اندر اگر تفکر کیا جائے تو یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ تمام موجودات خیالات یعنی اطلاعات میں قدر مشترک رکھتی ہیں....

Scanned by CamScanner

اس کی مثال یہ ہے کہ پانی کو انسان کے علاوہ حیوانات، نباتات یا جمادات..... سب ہی پانی سمجھتے ہیں اور اُس سے اسی طرح استفادہ کرتے ہیں جس طرح ایک آدمی کرتا ہے۔ جس طرح ہر مخلوق پانی کو پانی جانتی ہے اسی طرح آگ ہر مخلوق کے لئے آگ ہے۔ اگر آدمی آگ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے تو بکری، شیر، کبوتر اور حشرات الارض بھی آگ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک آدمی میٹھا پسند کرتا ہے، دوسرا طبعاً میٹھی چیزوں کی طرف راغب نہیں ہوتا..... لیکن ہر دو اشخاص میٹھے کو میٹھا اور نمک کو نمک کہنے پر مجبور ہیں۔

مصدر اطلاعات (Sorce of Information) کا علم جس کو ہم علم مابعد النفسیات بھی کہتے ہیں، ایک ایسا علمی دائرہ ہے جس کے اندر بے رنگی پائی جاتی ہے۔ جب اس بے رنگی میں لاشعور رنگ بھر دیتا ہے تو اس کی حیثیت نفسیات کی ہو جاتی ہے۔ شعور اس ایجنسی کا نام ہے جو معانی کو مظاہراتی لباس بخشتا ہے..... لاشعور اس رخ کا نام ہے جو کسی اطلاع کو معانی پہناتا ہے..... اور ورائے لاشعور ایک ایسا دائرہ ہے جس میں علم کی حیثیت محض علم کی ہوتی ہے..... یعنی وہ علم بحیثیت علم کے صرف ہوتا ہے..... لاشعور اپنی دلچسپی اور ماحول سے ملی ہوئی طرز فکر کے مطابق اسے معانی پہنا دیتا ہے۔

مثلاً بھوک ایک اطلاع ہے!....

جب تک یہ اطلاع ورائے لاشعور میں موجود ہے تب تک محض بھوک ہے لیکن لاشعور میں داخل ہونے کے بعد اس تقاضے کی تکمیل الگ الگ معانی پہنا کر کی جاتی ہے۔ بھوک کی اطلاع شیر اور بکری دونوں میں موجود ہے لیکن بکری اس اطلاع کی تکمیل میں گھاس کھاتی ہے اور شیر بھوک کی اس اطلاع کو پورا کرنے کے لئے گوشت کھاتا ہے.....

بھوک کے معاملے میں دونوں کے اندر قدر مشترک ہے البتہ بھوک کی اطلاع کو

Scanned by CamScanner

الگ الگ معانی پہنانا دونوں کا جداگانہ وصف ہے!.....

نوع انسانی میں شروع ہی سے تحقیق وتلاش کا جذبہ کام کر رہا ہے۔آدم زاد نے ابتدائے آفرینش ہی سے اپنے اردگرد موجود اشیاء کو سمجھنے اور اس پر تصرف حاصل کرنے کی کوشش کی۔وہ ہمیشہ اس سلسلہ میں طبع آمائی کرتا رہا کہ یہ پوری کائنات کیسے بنی؟.....

کیوں بنی؟.....

میں خود کیسے وجود میں آیا؟.....

اور میں فنا کیوں ہو جاتا ہوں؟.....

اس کوشش میں اس نے بہت سے مدراج طے کیے۔اول اول اس نے طبیعات کے میدان میں ہاتھ پیر مارے اور اس کی توجہ تحقیق مادے کو کو سمجھنے میں مرکوز رہی۔اُس نے اپنی خواہشات اور ضروریات کے مطابق دھات سازی،عمارت سازی،ریاضی،فلکیات، طب اور اسی طرح کے بہت سے علوم ک مدوّن کیے.....پھر ان علوم کو وسعت دیتا رہا.....

لیکن اس کے باوجود کائنات کی حقیقت اور ماہیت کو سمجھنے سے قاصر رہا.....

واضح رہے کہ یہ انسان کی عمومی حالت کا ذکر ہے کیونکہ ہر زمانے کے اندر نوع انسانی میں بہت سے ایسے حضرات موجود رہے ہیں جو ان قیود و پابندیوں سے ماوراء تھے اور ان کی صلاحیتیں لوگوں کے لئے مشعل راہ بنتی رہیں.....

سولہویں صدی عیسوی سے ترقی کی رفتار نے کروٹ لی اور اس میں تیزی پیدا ہوئی اور پھر یہ رفتار مسلسل بڑھتی چلی گئی.....انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے دوران علم طبعیات میں انقلاب برپا ہوا اور انسان کے سامنے نئی نئی راہیں اور نئے نئے علوم آتے رہے.....انسان نے لہروں کو دریافت کر کے ریڈیو اور ٹی وی ایجاد کر لیا.....

بجلی دریافت کر کے برقیات کی بنیاد رکھی.....فاصلے سمٹ گئے اور وقت کی اس حد تک نفی کر دی گئی کہ برسوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہونے لگا!.....

Scanned by CamScanner

ان تمام ترقیوں اور سوچ بچار نے انسان کے ذہن کو تیزی عطا کیا اور اُس نے یہ معلوم کرلیا کہ انسان کے شعور اور مادی حرکات کے پیچھے بھی لطیف حرکات موجود ہیں.....ان حرکات کے ذریعے مادہ حرکت کر رہا ہے.....آواز کی لہروں کی دریافت ان کے طول موج کی پیمائش اور لہروں کی دریافت نے ان خیالات کو تقویت دی۔

مزید جستجو کر کے علم نفسیات کی بنیاد رکھی گئی.....خیالات، تصورات اور احساسات جیسے غیر مرئی وجود کو اہم اور اثر پذیر عناصر سمجھ کر ان پر تحقیق کے دروازے کھول دیئے.....پھر انسان نے ایک قدم اور آگے بڑھایا.....

اس نے اپنی تحقیقات کے ذریعے طبیعیات اور نفسیات کے اس پار بسنے والی دوسری دنیا کا سراغ لگایا اور اس علم کو ما بعد الطبیعیات (Metaphysics) یا ما بعد النفسیات Parapsychology کا نام دیا.....

سائنس دان فوٹو گرافی کی اعلیٰ ترین تکنیک کیرلین فوٹو گرافی استعمال کر کے رنگ و نور کی دنیا میں داخل ہو گئے.....اور انہوں نے اس جسم مثالی ہالہ نور Aura کے وجود سے بھی واقفیت حاصل کر لی جو ہر مادی شئے پر محیط ہے.....

برسوں کے تجربات نے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچادی ہے کہ لہریں جو مادہ کو کنٹرول کرتی ہیں، اُن ہی کی بنیاد پر مادہ کا قیام ہے۔اب یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ انسان کے اندر صلاحیتوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جس میں سے ٹیلی پیتھی اور مستقبل بینی جیسی صلاحیتیں سامنے آچکی ہیں اور ان پر تحقیقی کام جاری ہیں۔

آج انسان اس نقطے پر ہے جہاں وہ مادے کو محسوس کرنے کے بعد لہروں پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

قرآن پاک کائنات کے تمام قوانین اور علوم کا سرچشمہ ہے.....سارے علوم کا اجمالی بیان ہے!.....

Scanned by CamScanner

قرآن پاک کے مضامین معنویت کے اعتبار سے دو بڑے حصوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ایک حصہ اُن اصول وقوانین پر مشتمل ہے جو ایک فلاحی معاشرے کے قیام کے لئے ضروری ہیں اور اسی حصہ میں اخلاقی اقدار اور قوموں کے عروج وزوال کے اسباب بھی بیان کئے گئے ہیں۔

دوسرا حصہ جو قرآن پاک کا ایک بڑا اہم حصہ ہے، اُن فارمولوں اور قوانین پر بحث کرتا ہے جن کے اوپر اللہ تعالیٰ نے کائنات کو تخلیق کیا ہے.... اسی حصے میں موت کے بعد کی زندگی کے حالات بھی شامل ہیں اور اس حصے کو معاد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ کائناتی قوانین ناقابل تغیر وتبدل ہیں!..... یہ ازل سے ایک ہیں اور ابد تک ایک ہی رہیں گے!...

قرآن پاک میں انہیں فطرت اللہ اور 'اللہ کا امر' بھی کہا گیا ہے..... اللہ کی سنت یا اللہ کا امر اُن قوانین اور فارمولوں کا مجموعہ ہے جن کے تحت ہر آن اور ہر لمحہ کائنات کے وجود کو زندگی مل رہی ہے۔

کائنات ایک مربوط اور منظم سلسلہ کا نام ہے جس میں کسی بے ربطگی یا اتفاق کا کوئی عمل دخل نہیں ہے!.....

سب کچھ ایک اٹل قانون کے تحت واقع ہو رہا ہے!.....

افسوس کی بات یہ ہے کہ قرآن کے دوسرے حصے کو اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ یہ عام فہم نہیں ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے شعوری مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے..... ایسا اس بناء پر ہے کہ اس علم کا تعلق لاشعور سے ہے!...

کوئی بھی لاشعوری علم اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتا، جب تک کہ طالب علم لاشعوری واردات وکیفیات سے نہ گزرے۔

قرآن پاک میں اُس علم کو 'علم الکتاب' کہہ کر بھی متعارف کرایا گیا ہے۔

Scanned by CamScanner

حضرت سلیمانؑ کے واقعہ میں مذکور ہے کہ انہوں نے اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ 'میں چاہتا ہوں کہ ملکہ سبا کے پہنچنے سے پہلے اس کا تخت شاہی دربار میں موجود ہو'۔

عفریت نے جو قوم جنات میں سے تھا۔ کہا 'اس سے پہلے کہ آپ دربار برخاست کریں میں یہ تخت لا سکتا ہوں!'

نوع جنات کے ایک فرد کا یہ دعویٰ سن کر ایک انسان، جس کے پاس کتاب کا علم تھا، یوں گویا ہوا..... 'اس سے پہلے کہ آپ کی پلک جھپکے تخت دربار میں موجود ہوگا'۔

حضرت سلیمانؑ نے رخ پھیر کر دیکھا تو ملکہ سبا کا تخت موجود تھا..... حالانکہ یمن سے بیت المقدس کا فاصلہ تقریباً پندرہ سو میل ہے..... اور یہ فاصلہ پلک جھپکنے میں طے ہو گیا.....

یہ 'علم الکتاب' اُن کائناتی قوانین اور فارمولوں کا نام ہے، جن کے تحت کائنات زندہ اور متحرک ہے!.....

زمین کی گردش..... آسمان سے پانی برسنا..... نباتات کا اگنا..... زمین پر موجود حیوانات اور جمادات کی پیدائش اور موت..... ان کی زندگی کی تحریکات..... سیاروں کی گردشیں ..... اُن میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں..... غرض کہ ہر حرکت کسی ایک قانون کی پابند ہے!.....

یہی علم آدم کو اللہ کی طرف سے بطور خاص ودیعت ہوا، جسے قرآن پاک میں 'علم الاسما' کہا گیا ہے اور اسی علم نے آدم کو فرشتوں پر فضیلت بخشی..... یہی علم مومن کی میراث ہے ..... اس علم کو جان کر کوئی انسان تسخیرِ کائنات کے فارمولوں سے واقف ہو جاتا ہے اور عناصر کو اُس طرح استعمال کر سکتا ہے جس کی مثال حضرت سلیمانؑ کے واقعہ میں قرآن نے بیان کی ہے۔ اس علم سے واقف ہو کر انسان وسائل کا محتاج نہیں رہتا بلکہ وسائل اُس کے تابع ہو جاتے ہیں اور وہ وسائل پر اشاروں سے حکمرانی کر سکتا ہے۔

وہ علم جس کو مابعد الطبیعیات (Metaphysics) یا مابعد النفسیات یا پیراسائیکالوجی (Parapsychology) کہتے ہیں، یہ انکشاف کرتا ہے کہ دنیا میں کسی

Scanned by CamScanner

عمل کی تکمیل خیال آئے بغیر نہیں ہوتی.....چاہے وہ عمل خوشی سے متعلق ہو یا غم سے۔

تصوف ہمیں بتاتا ہے کہ انسان تین پرت کا مجموعہ ہے۔

۱۔ذات

۲۔صفات

۳۔ذات اور صفات کو متعارف کرانے والا فرد.....اس پرت کو مادی جسم یا آدمی کہا جاتا ہے۔

ہر پرت کے محسوسات الگ الگ ہیں۔

ذات کا پرت وہم اور خیال کو، تصور بنا کر شعور میں منتقل کرتا ہے.....اور شعور تصورات کو خوشی یا غم میں رد و بدل کرتا ہے۔

شعور میں دو قسم کے نقوش ہوتے ہیں!....

ایک قسم کے نقوش میں لطیف انوار کا ذخیرہ ہوتا ہے اور دوسری قسم کے نقوش میں خود غرضی، تنگ نظری اور کثیف جذبات کا ذخیرہ رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو معین مقداروں سے تخلیق کیا ہے۔ معین مقداریں احکامِ الٰہی کے تابع ہیں۔ جب انسان اللہ کے احکام کی تعمیل کرتا ہے تو وہ خوش رہتا ہے اور اگر اللہ کے احکامات کے خلاف عمل کرتا ہے تو اس کی زندگی میں خوف اور غم شامل ہو جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:....

"میں نے آدم کو زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کیا ہے"۔

آدم کی نیابت اور خلافت علم الاسما سے مشروط ہے.....اگر انسان علم الاسماء نہیں جانتا تو نیابت اور خلافت زیرِ بحث نہیں آتی.....اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے عرض کیا کہ آدم زمین میں فساد کرے گا.... اللہ تعالیٰ نے علم الاسما سکھا کر آدم کو حکم دیا کہ بیان کر جو ہم نے تجھے سکھایا ہے۔ آدم

Scanned by CamScanner

نے جب اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ علم بیان کیا تو فرشتوں نے اعتراف کیا کہ ہم اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا علم آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے۔

مفہوم واضح ہے کہ آدم کی فضیلت اُس علم کی وجہ سے ہے جو علم فرشتے اور جنات نہیں جانتے.....

یہ علم اللہ تعالیٰ نے آدم کی روح میں منتقل کیا ہے...اس علم کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی روح کو جانتا ہو....روح کو جاننے کے لئے Matter اور روشنی ..... روشنی اور نور کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

اس علم کے حصول کا واحد ذریعہ قرآن حکیم کی تعلیمات، پہ غور وفکر کر کے اُن کو سمجھنا....اور سمجھنے کے بعد اُن کو عملی طور پر برتنا ہے۔نور چشمی ڈاکٹر مقصود عظیمیؒ نے قرآن حکیم پہ غور وفکر کرنے کی خواہش رکھنے والوں کی سہولت کے لئے جو کام کیا ہے....میری دعا ہے، اللہ تعالیٰ اُن کی اِس خدمت کو قبول فرما کر اس میں برکت عطا فرمائے اور اِس کام کو حضور ﷺ کے مشن کی پیشرفت ....یعنی لوگوں کو اپنی روح کے عرفان.....اور اُس کے ذریعے اللہ کے عرفان کا ایک ذریعہ بنا دے تا کہ وہ خلیفۃ الارض کی گراں مایہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔آمین

خواجہ شمس الدین عظیمیؒ

خانوادۂ سلسلہ عظیمیہ۔مرکزی مراقبہ ہال

کراچی

Scanned by CamScanner

حرفِ اوّل

دنیا میں موجود مذاہب میں سے زیادہ تر فروغ اور دوام انہی پیغمبروں اور انبیا کے مذاہب کو حاصل ہوا جن کو الہامی کتب عطا ہوئیں اور جن انبیا کو الہامی کتابوں سے نہیں نوازا گیا، اُن کے ماننے والے اپنے اپنے مذہب کو معدوم ہونے سے نہیں بچا سکے۔

کوئی بھی الہامی کتاب اُس وقت تک ہی الہامی رہتی ہے جب تک وہ تحریف اور تبدیلیوں سے محفوظ رہتی ہے لیکن جب انسانی عقل اپنی آسانی اور سہولت کی خاطر اُس میں آمیزش یا کمی بیشی کی مرتکب ہو جائے تو وہ کتاب شعورِ انسانی کی راہنمائی کی بجائے اُس میں پیچیدگی اور الجھاؤ کا سبب بن جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کا اصل اعجاز اور معجزہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کو کسی بھی قسم کی تحریف، کمی بیشی یا اضافے سے محفوظ فرما دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود یہ کتاب اپنے اصلی متن اور مکمل حالت میں نہ صرف امت مسلمہ بلکہ دنیا کے ہر ذی شعور فرد کے استفادے کے لئے دستیاب ہے۔

Scanned by CamScanner

دنیا پرست حکمرانوں نے الہامی کتب سے خود کچھ سیکھا یا نہیں، انہوں نے البتہ اس بات کا ہر ممکن اہتمام کیا کہ عوام کسی بھی طور الہامی کتب کے مندرجات کی اصل روح سے واقف اور آگاہ نہ ہو سکیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے دو کام کئے۔ ایک تو یہ کہ سوچ بچار اور غور و فکر کو ایک خاص طبقے کے لئے مختص کرنا اور دوسرا یہ کہ عوام کو دیگر الہامی کتب کی مانند قرآن کی خواندگی اور اُس کو حفظ یاد کرنے تک ہی محدود رکھنا۔ ان دو مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے جو جو کوششیں کیں ان کی تفصیل میں جائے بغیر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد میں بہر حال کامیاب ہی رہے ہیں۔ اُن کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ آج یہ بات کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ خود قرآن حکیم فرقان مجید میں ساڑھے سات سو سے زیادہ آیات میں انسان کو غور و فکر کی دعوت اور ترغیب دی گئی ہے۔

آج مسلمانوں کی زبوں حالی اور کسمپرسی کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ یہ قوم غور و فکر سے اس قدر تہی دامن اور محروم ہو چکی ہے کہ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ غور و فکر کیسے کیا جائے؟ تو وہ سوچ بچار کے عمل کو دشوار اور پریشان کن عمل بتا کر راہِ فرار اختیار کرنے کو کہہ دیتا ہے۔ ارے چھوڑو۔ یہ تم کس چکر میں پڑ رہے ہو۔ غور و فکر کا عادی ہونا تو بہت دور کی بات ہے، کسی مسئلے کے حل کے لئے کبھی ضرورتاً غور کرنا پڑے تو اکثر سر درد کی شکایت کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور یہ شکایت تو اُس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب مسئلہ اپنی ذات اور مفاد سے وابستہ نہ ہو۔ ذہنی پسماندگی کا یہ عالم اتنا عام ہے کہ کہیں کوئی سنجیدہ بات کی جائے تو لوگوں کو جمائیاں آنے لگتی ہیں۔

ہر دانشور اور علم رکھنے والے نے مسلمانوں کی زبوں حالی اور کسمپرسی دور کرنے، اقوامِ عالم میں ممتاز ہونے اور دُنیا اور آخرت میں سرخرو ہونے کا ایک ہی حل تجویز بتایا ہے۔ سوچ بچار اور غور و فکر۔ آج دنیا میں وہی قومیں ترقی یافتہ اور خوش حال ہیں جنہوں نے علم و عرفان

Scanned by CamScanner

کی راہوں کو اپنی سوچوں سے منور کیا اور غور و فکر سے دنیاوی علوم کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔

قرآن حکیم سے مسلمانوں کی عقیدت کو دیکھیں تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اللہ کی بجائے اسی کی پرستش کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنی ایک کتاب میں یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اور تو اور ہمارے دینی مدارس تک میں قرآن فہمی کا کوئی انتظام نہیں۔ عوام اس کی تلاوت کو ہی باعث ثواب اور توشہ آخرت مانتے ہیں اور علماء اس کے مختلف تراجم اور تفاسیر میں فروعی اختلافات کے گنجلک مسائل میں ہی الجھے ہوئے ہیں۔ ہر مسلمان گھرانے میں بچوں کو قرآن ناظرہ کی تعلیم ایک مذہبی فریضہ کا درجہ رکھتی ہے، اس کی روزانہ تلاوت کا اہتمام بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں ہی باتیں قرآن کی تفہیم کا ابتدائی زینہ ہیں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم اس ابتدائی زینے پر ہی رُکے ہوئے ہیں تو یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ ہم اس جمود سے نجات پانے کا کوئی اہتمام کیوں نہیں کرتے؟

قرآنِ حکیم کو ایک مقدس اور الہامی کتاب مان لینے کے بعد اپنی تقریبات کے آغاز میں برکت اور سعادت کے لئے اس کی تلاوت کرنے، کسی کے مرنے پر مساجد سے ملاؤں کو بلا کر ختمِ قرآن کروانے، مشکل وقت میں یا کسی مسئلے کے حل کے لئے غیبی امداد کے حصول کی خاطر اس کا ختم کروانے کے علاوہ ہم نے اور کیا کیا ہے؟ حفظِ قرآن اور تجوید و قراءت کے درجنوں انداز اپنانے اور اُن سے محظوظ ہونے کو طرح طرح کے اہتمام کرنا تو ہمیں بہت اچھا لگتا ہے لیکن اس کلامِ حقیقی کی اصل معنویت سے واقف ہونے کو اور اس کی درست تفہیم کی خاطر کی گئی کوششوں کو کسی بھی طور بھرپور اور احسن نہیں مانا جا سکتا۔ ہم اس میں دی گئی ہدایات میں مستور اُس حکمت اور برتر دانائی کو کیوں تلاش نہیں کرتے جس کو اپنا کر ہم دنیا اور آخرت دونوں کو سنوار سکتے ہیں؟ ہم کہنے کو یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ اس کتاب میں ہمائی

Scanned by CamScanner

کئی باتوں پر عمل پیرا ہو کر ہی ہم دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو سکتے ہیں، لیکن اس بات کو اس طرح سے ماننے سے کئی کتراتے ہیں جس طرح سے اس کو ماننے کا حق ہے؟ اس رفیع الشان کتاب کو اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے میں ہمیں جو دشواری محسوس ہوتی ہے ہم اُس دشواری پر قابو پانے کا کوئی اہتمام کرنے سے کیوں شرماتے ہیں؟ ہمیں اس بات کا بہت ہی گہرا احساس اپنے اندر پیدا کرنا ہی ہوگا ورنہ ہم جس سطح کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس کو ہر گزرتے دن کے ساتھ دوسروں کے لئے دیدۂ عبرت نگاہ بننے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

اس احساس کو فزوں تر کرنے کے لئے سب سے پہلے تو ہمیں اپنے اندر یہ بات واضح طور پر راسخ کر لینا چاہیئے کہ قرآن حکیم ایک ایسی دستاویز ہے جو الوہی انتظام کے ساتھ دنیا کے ہر ہر فرد کے لئے دستیاب کر دی گئی ہے۔ اس لئے ہر فرد کو اس سے استفادہ کرنا اور اپنی زندگی کی عملی راہوں کو اس کے مطابق ڈھالنا ضروری ہے اور امت مسلمہ کے افراد کے لئے تو یہ اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کیوں کہ اُن کو تو پیدا ہوتے ہی یہ عظیم دستاویز اپنے سر جھانے دھری ملتی ہے۔

جب تک ہم یہ سمجھ کر اس کتاب سے مستفیض ہونے کی کوشش کرتے رہیں گے کہ یہ کتاب آج سے چودہ سو سال قبل محمد مصطفےٰ ﷺ پر نازل ہوئی اور (خدانخواستہ) یہ صرف انہی کے لئے تھی، تب تک ہم اس کی حقیقی تفہیم سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے..... کیونکہ اس طرح سوچنے سے ہم بیک وقت دو غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اول تو یہ کہ ہم اپنے اور اس کتاب کے مابین چودہ سو سال کے زمانی فاصلے کی اتنی اونچی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں جس کو ہمارا کمزور اور محدود شعور عبور کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ قرآن مجید تو روزِ ازل ہی سے لوحِ محفوظ پر موجود تھا۔ وہاں سے اس کا نزول وحی کے ذریعے حضور ﷺ کے قلبِ اطہر پر ہوا۔ آپ ﷺ کے ذہنِ مبارک میں کسی زمانی یا مکانی فاصلے کی کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔

Scanned by CamScanner

اس لئے جب ہم قرآن مجید سے استفادے کا عزم کریں تو ہمارے ذہنوں میں بھی ایسی کوئی دیوار نہیں ہونی چاہیئے۔

قرآن مجید تو ایک ایسی ازلی اور ابدی تحریر ہے کہ اس کی طرف کوئی جب بھی متوجہ ہو، تو وہ اُس دور کی ضرورتوں کے مطابق مفہوم سامنے لانے کا اعجاز رکھتی ہے۔ یعنی اس کتاب میں یہ عجیب صلاحیت موجود ہے کہ یہ انسانی شعور کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور شعور کو مزید جلا دیتی ہے۔

دوسری غلطی ہم سے یہ ہوتی ہے کہ ہم اس کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کے لئے مختص قرار دے کر خود کو اس سے جڑنے سے بری الذمہ قرار دے دیتے ہیں۔ ہم کسی بھی ایسی چیز سے خود کو وابستہ نہیں کر پاتے جس کی بابت ہمارے شعور میں یہ بات موجود ہو کہ اس کا ہم سے کوئی راست تعلق نہیں ہے۔ اس بشری کمزوری پر قابو پانے کا واحد راستہ یہی بنتا ہے کہ اس کتاب کا ہر قاری اس بات کو اپنے ذہن میں واشگاف انداز میں طے کر لے کہ یہ کتاب اس کے لئے ایک انتظام کے تحت اس تک پہنچائی گئی ہے۔ اس لئے یہ بات اس پر واجب ہو جاتی ہے کہ وہ اس کے مندرجات پہ اس طرح غور کرے کہ اس کی رسائی اس کے اصل اور درست مفہوم تک ہو سکے۔ جب کوئی انسان خود کو کسی چیز سے وابستہ اور منسلک کر کے اس میں دلچسپی لیتا ہے تو اس کی فکر اُن راہوں کی طرف جانے میں آسانی محسوس کرتی ہے جن پر چل کر وہ اُن باتوں کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے جو اس کو سمجھ آ جائیں۔

کسی بھی بات کے درست، حقیقی اور اصل مفہوم تک رسائی کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر غیر جانبدارانہ انداز نظر اور طرز فکر پیدا کرے۔ عظیم روحانی سائنسدان حضور قلندر بابا اولیاء رحمتہ علیہ کا ارشاد عالی مقام ہے کہ معاملات کی درست تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ انسان میں عدالت جیسا غیر جانبدار انداز فکر موجود ہو۔ حضور بابا صاحبؒ اپنی

Scanned by CamScanner

معرکتہ الآرا، کتاب 'لوح وقلم' میں تحریر فرماتے ہیں۔

'انسان جب کسی زاویہ کو صحیح طور پر سمجھنا چاہتا ہے تو اس کی حیثیت غیر جانبدار یا عدالت کی ہوتی ہے اور وہ بحیثیت عدالت کبھی فریق نہیں ہوتا۔ عدالت کو مدعی اور مدعا علیہ کے معاملات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے عدالت ہی کا طرز ذہن استعمال کرنا ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے ایک طرز ذہن فریق کا ہے اور ایک طرز ذہن عدالت کا ہے۔ ہر شخص کو طرز فکر کے دو زاویے حاصل ہیں۔ ایک زاویہ بحیثیت اہل معاملہ ر دوسرا زاویہ بحیثیت غیر جانبدار۔ جب انسان بحیثیت غیر جانبدار تجسس کرتا ہے تو اس پر حقائق منکشف ہو جاتے ہیں۔ تجسس کی یہ صلاحیت ہر فرد کو ودیعت کی گئی ہے تا کہ دنیا کا کوئی طبقہ معاملات کی تفہیم اور صحیح فیصلوں سے محروم نہ رہ جائے۔'

اس بات کی وضاحت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ قرآنِ حکیم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے جب بھی کسی انسان نے بحیثیت غیر جانبدار عدالت کے ذہن کے ساتھ تجسس کیا ، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی کتاب کی ایسی تفہیم عطا فرماتے ہیں جو بالکل درست اور صحیح ہو اور اصل حقائق کے عین مطابق ہو۔

جب انسان کسی بات کو صحیح انداز میں سمجھ لیتا ہے تو اُس کے لئے اُس بات پر عمل کرنا اور اس عمل پہ مستقل کار بند رہنا کچھ زیادہ دشوار نہیں رہتا۔ جب کوئی ایک بات درست طور پر سمجھ میں آ جاتی ہے تو اس سے متعلقہ بہت سی مزید باتیں بھی صحیح انداز میں ذہن نشین ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

قرآنِ حکیم پہ غور وفکر کا آغاز کرنے سے پیشتر اگر اس بات کو ذہن نشین کر لیا جائے کہ اس کتاب کا اصل مقام کیا ہے تو ہمیں قرآن کے قریب ہونے میں زیادہ سہولت اور آسانی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم قرآن کو محض قوانینِ شریعہ، علوم روحانی اور انکشافات کی حامل

Scanned by CamScanner

دستاویز مان کر اس کا مطالعہ کریں گے تو ہماری فہم انہی حدود میں مقید رہ جائے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم خود کچھ بھی طے نہ کریں بلکہ کھلے ذہن کے ساتھ یہ دیکھنے کو اس کا مطالعہ کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے ہمیں کیا سمجھانا چاہتے ہیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتنا رفیع الشان انتظام اور اہتمام کیا ہے کہ آئندہ رہتی دنیا تک اس کتاب کو نوع انسانی کی راہنمائی اور تربیت کے لئے ایک مکمل اور جامع ترین دستاویز بنا دیا ہے۔ راہنمائی اور تربیت کی دستاویز سمجھ کر اس کی طرف رجوع کرنے سے انسانی فکر کی راہنمائی اور ذہنی تربیت کا ایسا جامع اور مکمل انتظام ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں مسلمان نہ صرف اپنی زبوں حالی اور ابتری پر قابو پا سکتے ہیں بلکہ وہ دنیا میں شرف اور امتیاز سے بھی سرفراز ہو سکتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو قرآن حکیم کی وہ سمجھ اور فہم عطا فرمائے جیسی فہم اور سمجھ قرآن کا حق اور اللہ تعالیٰ کا منشا اور مطلوب ہے۔

Scanned by CamScanner

کلمہ گو مسلمان

بحیثیت نبوی کی غرض وغایت کے حوالے سے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے مبعوث فرمایا تھا کہ وہ کفار اور مشرکین کو توحید کا درس دے سکیں اور ان کو اللہ اور اُس کی وحدانیت سے واقف اور روشناس کروا سکیں۔ اب اس بات کو سن کر کوئی اس طرف توجہ نہیں دیتا کہ حضور ﷺ کے اپنے والد محترم کا نام نامی عبداللہ تھا یعنی اللہ کا بندہ۔ جب حضرت عبدالمطلب اپنے بیٹے کا نام تجویز کر رہے تھے اس وقت عرب میں بہت سے افراد ایسے تھے جن کا نام عبداللہ تھا۔ اس بات کا ایک ہی مطلب ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات تو ازل سے لوگوں کے تعارف میں تھی اور یہ بات اُن کے علم میں تھی کہ اُس ذات سے انسان کا رشتہ عبدیت ہی کا ہو سکتا ہے..... تو پھر حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کس کام کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے؟

غیر جانبدار زاویہ نظر سے اس بات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف وجوہات کی بنا پر، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اللہ کی الٰہیت، واحدانیت اور الوہیت کا تصور بگاڑ کا شکار ہو گیا تھا اور ہر فرد نے اپنے اپنے ذہن اور ضرورت کے مطابق اللہ کا ایک ایسا منفرد اور متفرق تصور قائم کر لیا تھا جو اللہ کے اصل، جائز اور مناسب تصور سے کوسوں دور

Scanned by CamScanner

اور غلط تھا۔ اللہ کے بارے میں متفرق تصورات سے اللہ کا تو کچھ نہیں بگڑتا البتہ مخلوق آپس میں انتشار اور افتراق کا شکار ہو جاتی ہے۔

اللہ اپنی مخلوق کا سب سے بڑھ کر بھلا چاہنے والا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا کہ وہ اُس کی بابت بگڑے ہوئے تصورات کو درست فرمادیں۔ اسی بات کو لے کر حضور ﷺ حرا سے اتر کر آئے اور لوگوں سے اپنے اپنے ذہنوں میں موجود تصورات کو چھوڑ کر اُس طرح سے اللہ کو الٰہ ماننے کی دعوت دی جس طرح سے اللہ پاک چاہتا ہے۔ لوگوں نے اس بات کو اپنے اپنے مفاد کے خلاف جانتے ہوئے اس بات سے انکار کیا اور اپنے اپنے تصور الٰہیت والوہیت کو سینوں سے لگائے رکھنے پر اصرار کیا۔ اُن کے انکار اور حضور ﷺ کے اصرار سے بات شروع ہو کر ہجرت، غزوات اور فتح مکہ پر منتج ہو کر تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔

اس تاریخی سفر کی داستان ہر مسلمان کے علم میں ہے۔ واقعات کی تفصیل، مصلحتوں کی دھول سے آلودہ ہونے کے باجود، کتابوں میں محفوظ ہو چکی ہے۔ لیکن اس بات پہ سبھی کا اتفاق ہے کہ جب حضور ﷺ کسی کافر، مشرک یا اہل کتاب میں سے کسی کو دائرہ اسلام میں داخل فرماتے تھے تو اُس کو کلمہ طیبہ تعلیم فرماتے تھے۔ اسی وجہ سے 'کلمہ گو بھائی' کی اصطلاح وجود میں آئی۔ کلمہ طیبہ کا باطنی مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمان ہونے والا شخص یہ عہد کرتا ہے کہ آئندہ وہ اللہ کو صرف اُس طرح سے الٰہ مانے گا جس طرح سے اللہ کا رسول محمد ﷺ بتائے اور سمجھائے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی بابت کسی بھی غلط تصور کو اللہ کے رسول محمد ﷺ سے بڑھ کر بھلا اور کون درست کر سکتا تھا؟ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق اللہ کی درست، مکمل اور صحیح تعریف کو قرآن مجید کی صورت آئندہ نسلوں کی ذہنی اور روحانی تربیت اور راہنمائی کے لئے محفوظ اور مامون فرمادیا۔ ایک حدیثِ قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کا ارشاد عالی مقام یہ ہے۔

Scanned by CamScanner

میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے مخلوق کو محبت کے ساتھ پیدا کیا تا کہ میں پہچانا جاؤں یعنی عرفانِ الٰہی کی خواہش وجہ تخلیق کائنات ہے اور حضور ﷺ کو اسی وجہ سے باعثِ تخلیقِ کائنات بھی گردانا جاتا ہے کہ معرفتِ الٰہی کا جیسا حق آپ ﷺ نے ادا کیا کسی اور سے نہ ہو سکا اور نہ ہی کسی اور سے ہو سکے گا۔

ہر اس شخص کو جو اللہ کو اُس طرح سے سمجھنا چاہتا ہے جس طرح سے اللہ کے رسول ﷺ نے سمجھا اور سمجھانا چاہا، کلمہ پڑھ کر یہ عہد کرنا پڑتا ہے کہ وہ اللہ کو سوائے اس طرح سے الٰہ اور معبود نہیں مانے گا جس طرح سے اللہ کے رسول محمد ﷺ نے تعلیم کیا۔ کلمہ پڑھ کر کیے گئے اس اقرار کے بعد ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو اللہ کے رسول محمد ﷺ کے بتائے ہوئے تصور کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے؟

ہم جانتے ہیں کہ حقیقت ایک ہی ہوا کرتی ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مسلمان کے ذہن میں اللہ کا جو تصور ہے وہ دوسرے مسلمان کے تصور الٰہیت سے یکسر مختلف ہے۔ اسی اختلافِ تصور سے اختلافِ رائے نے جنم لیا جو بڑھ کر جدا جدا مسلکوں کی صورت اختیار کر گیا اور وحدانیت کا درس، بہتر (۷۲) فرقوں نے اپنے اپنے انداز میں سمجھنا اور سمجھانا شروع کر دیا۔ اب ایک مسلک کے مطابق اللہ تعالیٰ سر نہ ڈھانپنے یا ننگے کے زیرِ جامہ ہونے پہ ناراض ہو جاتے ہیں اور دوسرے مسلک کے مطابق رفع یدین پہ خوش ہو جاتے ہیں۔ کسی مسلمان کے نزدیک اللہ تعالیٰ وسیلہ کو سرے سے ہی قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے اور وہ قرآن کی موجودگی میں کسی حدیث تک کو درخورِ اعتنا گردانتے سے کتراتے ہیں۔ اسی طرح کچھ کے نزدیک قرآن متشابہات اور ناسخ اور منسوخ آیات کا مجموعہ ہونے کے سبب مشکوک ہے۔ ایک مسلمان کا اللہ.... اپنا جائز حق تک لینے سے منع فرماتا ہے اور دوسرے کا اللہ..... کسی کے ناجائز قتل تک کا بُرا نہیں مناتا۔ یہ سب اختلافات کیسے اور کیونکر ختم ہو سکتے ہیں؟ اِس وقت پوری امت مسلمہ کے حکمران اور علما اتحاد بین المسلمین کے داعی اور مبلغ ہونے کے باوجود ان اختلافات سے

Scanned by CamScanner

چھٹکارا پانے کی کوئی قابلِ عمل حتمی تجویز سامنے لانے اور اس کو سب سے منوانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔

جب تک مسلمان اس بنیادی بات کو ذہن نشین نہیں کر لیتے کہ انہیں کلمہ گو ہونے کے ناتے اللہ تعالیٰ کو اس طرح سے اللہ تسلیم کرنا ہے، جس طرح سے اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ کو متعارف کروایا ہے۔ نہ اس سے کسی قدر کم نہ ہی کسی قدر زیادہ۔ اس وقت تک 'واعتصمو بحبل الله جميعا' کے حکم کا شرمندۂ تعبیر ہونا محض ایک خام خیالی ہی ہو سکتی ہے۔ جب تک ہر انسان بالعموم اور ہر مسلمان بالخصوص، اللہ خالقِ کائنات کو اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق ڈھال کر اس کو 'اللہ' مانتا رہے گا.... اللہ کی ناراضگی اوبار بن کر اس کی فلاح کے آڑے آتی رہے گی۔ جب بھی کسی انسان نے اللہ کو اُس طرح سے اللہ تسلیم کر لیا جس طرح اللہ خود چاہتا ہے تو اس کو فلاح نصیب ہو گئی۔ 'اللہ کی رسی' اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں انسانی ذہن میں موجود تصورِ الٰہیت کے سوا اور کیا ہے؟ اس تصورِ الٰہیت کا صحیح اور یکساں ہونا ہی انسان کو تفریق وانتشار سے بچنے کی ضمانت فراہم کر سکتا ہے۔

اپنی خواہش اور مرضی کے خدا تراشنا، انسان کی بہت ہی پرانی کمزوری رہی ہے۔ حضرت آدمؑ کے دنیا میں آنے اور نوعِ انسانی کی ترویج اور اس میں اضافے کے ساتھ ہی انسان مظاہر پرستی کے جال میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ہر دور میں اُس کو اپنی راہنمائی سے نوازا۔ کہتے ہیں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے اللہ کے حکم کے تحت انسان کو مظاہر پرستی سے روکنے اور اور انہیں اللہ رب العالمین کی طرف متوجہ کرنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان میں سے بعض نے نبی آخر الزمان ﷺ کی ذاتِ اقدس کی بابت، اُن کی بعثت اور خدا رسائی کی نوید اور بشارت بھی دی۔ حضور ﷺ سے قبل ہر نبی، پیغمبر اور رسول نے انسانوں کو اپنی مرضی کے بت تراشنے اور اُن کی پوجا سے منع فرمایا۔ حضور رحمۃ اللعالمین ﷺ نے بھی یہی کیا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو اپنی مرضی کے تصورات کو خدا سے وابستہ کرنے اور خدا کو اپنی خواہشات کے زیرِ اثر سمجھنے سے باز رہنے کا درس دیا۔ حضور ﷺ اس لحاظ سے

Scanned by CamScanner

اپنے مشن میں زیادہ بہتر انداز میں کامیاب رہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف خود مقامِ محمود تک رسائی حاصل کی بلکہ اپنی امت کے لئے خدا شناسی کا ایسا نظام وضع فرما دیا کہ رہتی دنیا تک مزید کسی اور نظام کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔

اس بات کو بہت دھیان سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ حضور ﷺ نے ہمیں اللہ کا کیا تصور دیا اور ہم اپنے اندر اللہ کا جو تصور بسائے ہوئے ہیں وہ آپ ﷺ کے بتائے ہوئے تصور کے کتنا قریب یا کتنا دور ہے؟ اس سے کتنا متماثل ہے یا کتنا مختلف ہے؟ لیکن اس بات کا جائزہ تو اسی وقت لیا جا سکتا ہے جب ہمیں یہ بات معلوم ہو کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں خدا کا جو تصور دیا ہے وہ اصل میں ہے کیا؟ ہم اپنے اندر بسے اللہ کے تصور کی جگہ اللہ کے اُس تصور کو بسانے پہ کس قدر آمادہ اور تیار ہیں جس کو اللہ کے رسول نے پیش کیا۔ جب ہم اپنے بنائے ہوئے تصور کی جگہ اللہ کے حقیقی تصور کو قبول کرنے پہ آمادہ و تیار ہو ں گے تو ہمیں یہ تلاش کرنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا وہ حقیقی تصور (The Real Concept) جس کو حضور نبی آخر الزمان ﷺ نے پیش کیا، کیا ہے؟ اس تلاش میں سب سے زیادہ ضروری زادِ راہ یہی ہے کہ ہم اپنے تمام تر خلوص اور اخلاص سے انتہائی غیر جانبدار ہو کر، کسی تعصب اور مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر حضور سرورِ کائنات ﷺ کے ذریعے اللہ ہی کے بخشے ہوئے قرآن حکیم فرقانِ مجید کی تفہیم میں کوشاں ہو جائیں۔

جب تفہیم کی بات کی جاتی ہے تو اس بارے میں سب سے بڑا مغالطہ انسانی شعور کو یہ درپیش ہوتا ہے کہ جو بات ایک فردِ واحد کی سمجھ میں آ جاتی ہے وہ اُسی کو درست مانتا ہے اور اُسی بات کو کوئی دوسرا فرد کسی اور انداز میں سمجھتا اور مانتا ہے۔ یہاں سے اختلافِ رائے جنم لیتا ہے اور یہی اختلافِ رائے بڑھ کر مختلف نظریات پر منتج ہو جاتا ہے۔ نظریات کا اختلاف ان نظریات کے ماننے والوں کے درمیان ٹکراؤ کا سبب بنتا رہتا ہے۔ اس بات کو جب ہم شعوری طرزوں سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو شعور اپنی محدودیت کے

Scanned by CamScanner

باعث سب افراد کے انفرادی زاویہ ہائے نظر پر حاوی ہونے سے قاصر رہتا ہے۔ اگر کسی حد تک کامیاب ہو بھی جائے تو وہ حل محض ایک اقلیتی گروہ ہی کو مطمئن کر پاتا ہے۔ اکثریت پھر بھی باہم متفرق ہی رہتی ہے۔

اس بات کا منطقی حل تو یہی بنتا ہے کہ کسی طرح شعور کی محدودیت سے باہر نکل کر اور اُس سے اوپر اُٹھ کر اس حل کو تلاش کیا جائے جو حقیقتِ ثابتہ ہونے کی وجہ سے کسی بھی اختلاف کی گنجائش نہ رکھتا ہو۔ حقیقت کبھی دو نہیں ہو سکتی، حقیقت ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے۔ جب ہم کسی بات کی کُنہ تک پہنچ کر اُس کی حقیقت کو جان لیتے ہیں تو پھر نہ اختلافِ رائے باقی رہ سکتا ہے اور نہ اختلافِ نظریہ..... حقیقت مطلقہ اور ثابتہ ایسی حقیقت کو کہا جاتا ہے جس میں کسی تغیر و تبدل کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ زمانی اور مکانی تغیر و تبدل سے محفوظ بات ہی ایسی حقیقت ہوتی ہے جو سب کے لئے یکساں طور پر ایک ہی طرح کا مفہوم رکھتی ہے۔ مثلاً پانی..... پانی ایک حقیقت ہے..... جمادات ہوں یا نباتات، حیوانات ہوں یا جن و انس..... وہ پانی کو اپنی اپنی زبان میں خواہ کسی بھی نام سے پکارتے ہوں..... سبھی پانی کو پانی ہی جانتے ہیں اور اس سے اپنی تشنہ کامی کو دور کرتے اور اُسے اپنی سیرابی کا واحد ذریعہ مانتے ہیں۔ کبھی نہیں کوئی دو افراد اس بات پہ تکواریں نہیں سونتتے کہ پانی پیاس نہیں بجھاتا..... یا یہ کہ پانی کو پانی نہیں کہنے دوں گا۔

جب دو انسان کسی بھی بات کی حقیقت کو جان لیتے ہیں تو اُس کی بابت اُن میں اختلاف باقی نہیں رہتا۔ اگر انسان اُس حقیقت کو جاننا اور واقف ہونا چاہتا ہے جو غیر متبدل اور لاتغیر ہو تو اُس کو شعور سے اوپر اٹھ کر اپنے لاشعور تک رسائی حاصل کرنا لازم ہے۔ قرآن کے ازلی اور ابدی حقائق کو جاننے اور اُن کا وقوف حاصل کرنے کے لئے لاشعور کی آگہی اور جانکاری سے استفادے کی کوشش کرنے کو منطقی استدلال سے لے کر قوتِ القا اور وجدان تک جو بھی ذریعہ برتا جائے وہ کم ہی رہتا ہے۔

Scanned by CamScanner

لَا رَیْبَ فِیْہِ

جب انسان کسی بات پہ گہرائی میں تفکر کرتا ہے تو تفکر کے اس عمل میں انسان کی توجہ کسی ایک نکتے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اس نکتے کی تکرار کی جائے تو انسانی ذہن میں اس نکتے سے متعلق مختلف زاویے اجاگر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ذہن میں کسی بات کے حوالے سے مختلف زاویوں کا آنا ایک بات ہے اور ان میں سے درست اور صحیح زاویے کا انتخاب ایک الگ بات ہے۔ اس انتخاب کے لئے ذہن کو تربیت درکار ہوتی ہے۔ یہ تربیت انسان میں کھرے کھوٹے کی پہچان اور ان کے مابین امتیاز کرنے کے صفت اور صلاحیت کو ابھارتی ہے۔ معروف روحانی سکالر جناب خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ انسان کی یہ صفتِ امتیاز ہی وہ شے ہے جس کو قرآن 'حبل الورید' کی اصطلاح استعمال کر کے سمجھانا چاہتا ہے۔ یعنی اللہ تو انہی کے قریب ہوتا ہے جو اپنی اس صفتِ امتیاز کا بھرپور استعمال کرتے ہیں کیونکہ رگِ جان سے مراد ہے انسان کی صفت امتیاز۔

Scanned by CamScanner

الم. ذالک الکتاب لا ریب فیہ. قرآن حکیم کے آغاز میں ہی اِن الفاظ کا استعمال اللہ جل جلالہٗ کی بسیط حکمتوں کا ایک ادنیٰ سا نشان ہے۔ ان الفاظ کا عام مفہوم جو بیان کیا جاتا ہے وہ کچھ یوں ہے۔ 'یہ ہے وہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں'۔ اس بات پہ گہرائی میں غور کرنے سے بہت سے سوال ذہن میں آتے ہیں۔ ان سوالوں کے شافی جواب تلاش کریں تو انسان جس حتمی نتیجے پر پہنچتا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ 'ریب' کہتے ہیں آڑے ترچھے پن کو اور کتاب استعارہ ہے ایک طے شدہ سانچے کا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ انسان کو مخاطب کر کے فرما رہے ہیں کہ یہ کتاب ایک ایسا سانچہ ہے جس میں ڈھلنے کے بعد ذہن میں کوئی آڑا یا ترچھا پن باقی نہیں رہتا۔

تاج الدین بابا اولیاءؒ ناگپوری فرماتے ہیں۔ 'انسان درحقیقت تفکر کا ایک پیٹرن ہے'۔ اس پیٹرن میں آڑا ترچھا پن اور کجی انسان کی اس دنیا میں زندگی کو تو دشواریوں سے دوچار کرتی ہی ہے وہ اس کی آئندہ زندگی یعنی حیات بعد الموت کے لئے بھی ایسے مسائل پیدا کر دیتی ہے جن سے انسان ابدالآباد تک دوچار رہتا ہے۔ اسی ٹیڑھے پن اور کجی کی اصلاح اللہ تعالیٰ کا مطمع نظر ہے۔ ذہن کو اس کتاب کے سانچے میں ڈھالنے کا نسخہ اسی آیت کے اگلے الفاظ ھدی اللمتقین میں بیان ہوا ہے۔

ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں کہ متقی سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ کے بارے میں اپنے اندر ذوق رکھتا ہے اور اس ذوق کی وجہ سے وہ اللہ کو سمجھنے میں نہایت احتیاط سے کام لیتا ہے۔ اسی احتیاط کو مترجمین اور مفسرین نے ڈر، خوف اور پرہیزگاری کا نام دیا۔ ہم نے ڈرنے کا مفہوم خوفزدہ رہنا تو لیا محتاط ہونا نہیں۔ ہم نے پرہیزگاری کو برائی سے بچنا تو جانا لیکن غلط بات کو ذہن میں در آنے سے بچنے کو نہیں مانا۔ جب حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا کہ تقویٰ سے کیا مراد ہے تو آپؓ نے دریافت کیا۔ کبھی ایسے راستے سے گذر ہو جہاں خاردار جھاڑیاں ہوں تو آپ کیا کرتے ہیں؟ جواب میں یہ سن کر کہ ہم اپنے دامن سمیٹ لیتے ہیں

Scanned by CamScanner

تاکہ کانٹوں سے بچ سکیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ 'اسی (احتیاط کے عمل) کو تقویٰ کہتے ہیں'۔

یعنی یہ کتاب فقط اُن لوگوں کی ذہنی تربیت اور راہنمائی کرتی ہے جو سمجھنے میں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ سمجھنے میں احتیاط! کس بارے میں؟ اسی آیت کے اگلے حصے میں بیان ہوتا ہے 'الذین یومنون بالغیب' یعنی وہ ایسے لوگ ہیں جو باطنی دنیا کو مانتے ہیں۔ ہر اس بات کو غیب کہا جاتا ہے جو انسان کے ظاہری مشاہدے میں نہ ہو۔ جو چیز انسان کے لئے غیب ہے وہ اللہ کا حضور ہے۔ یعنی اللہ کے سامنے حاضر ہے۔ اللہ کے لئے کوئی چیز غیب نہیں ہے۔ یعنی انسان کو اللہ کی حضوری کے مشاہدے کے حصول میں احتیاط سے جتے رہنا چاہئے۔

مشاہدے کے لئے ذہن میں یقین کا ایسا پیٹرن ہونا ضروری ہے کہ جس سے ان دیکھی دنیا بھی ادراک میں آ جائے۔ یومنون کا ترجمہ ایمان رکھنا اسی لئے کیا جاتا ہے کہ ایمان کا تعلق یقین سے ہے اور جس چیز کا یقین ہو وہ بات انسان کی مشاہدے میں آ جاتی ہے۔ اللہ بھی غیب ہے۔ فرشتے اور جنات کی دنیا بھی غیب ہے۔ آنے والا وقت، خواہ وہ اگلا لمحہ ہو یا ہزاروں سال بعد کا مستقبل، سبھی غیب ہے۔ غیب سے متعلق کوئی بھی بات انسان کے مشاہدے میں تبھی آ سکتی ہے جب انسان کو اس کے ہونے کا یقین حاصل ہو۔ یقین ایک باطنی کیفیت ہے اور غیب کی تمام راہیں انسان کے باطن میں ہی کھلتی ہیں۔ جب انسان اس بات کو تسلیم کر کے اپنے باطن کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اللہ اُس پر غیب کی دنیا کے اسرار منکشف فرما دیتا ہے۔

اب یہ یقین اور مشاہدہ کیسے حاصل ہو اور اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ قرآن کسی بات کو ادھورا نہیں چھوڑتا۔ اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ 'ویقیمون الصلوٰۃ' اور وہ اللہ سے اپنا ربط اور تعلق استوار رکھتے ہیں۔ نماز قائم کرنا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انسان کا تعلق اور ربط اللہ سے استوار بھی ہو جائے اور جڑا بھی رہے۔ اللہ سے ربط اور تعلق کی عملی صورت 'نماز' ہو تو اس تعلق اور ربط کو اپنی زندگی میں کیسے اور کیونکر نافذ کیا جائے اور اس نفاذ کی

Scanned by CamScanner

عملی صورت کیا ہونی چاہیئے؟ اس بات کو کلام مجید کے ان الفاظ میں بیان کر کے اللہ تعالیٰ بات کو منطقی انجام تک لے آتے ہیں۔ "و مما رزقنھم ینفقون" اور جو کچھ ہم انہیں عطا کرتے ہیں وہ اس کو مناسب انداز میں برتتے ہیں۔ اگر ہم رزق کو اشیائے خورد و نوش تک ہی محدود نہ سمجھیں تو ذہن میں آنے والے خیالات تک اس فہرست میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ینفق کا مفہوم خرچ کرنے اور کسی چیز کو خود سے جدا کرنے سے لے کر اس کو برتنے اور استعمال میں لانے تک پر محیط اور حاوی سمجھا جائے تو بات کی معنویت اور افادیت ذہن کے تاریک گوشوں کو منور کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ ورنہ تو ہمارے ذہن میں لگے ہمارے مفروضوں کے جالے کسی بات کے واضح ہونے میں رکاوٹ کا سبب بنے ہی رہتے ہیں۔

قرآن حکیم کو اپنی زندگیوں میں عملی طور پر نافذ کرنے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کی خواہش بھلا کس مسلمان کی نہ ہوگی۔ لیکن اس کے باجود ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ نہ ہونے کے برابر ہی ہیں جن کی بابت یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکے کہ وہ اپنی زندگی قرآن کی تعلیمات کے مطابق بسر کرنے میں واقعی کامیاب رہے۔ اس بات کا جائزہ لیا جائے تو تعلیم کی کمی، تربیت کے فقدان اور ناسمجھی کے علاوہ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں حائل ہماری سہل پسندی، وہ وجوہات ہیں جن کے سبب کسی مسلمان کو قرآن کی تعلیمات پہ عمل پیرا ہونا دشوار محسوس ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر اس دشواری پر قابو پانے کی کوشش کرنا فرد کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ کہنے کو اس کا سب سے احسن طریقہ تو یہی ہے کہ انسان قرآن حکیم کی تعلیمات کو سمجھنے کی خاطر اس کا مطالعہ کرے اور جو بات جس قدر بھی سمجھ آ جائے اس پر عمل پیرا ہوا جائے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں ایک ایسا نظام مرحمت فرمایا ہے کہ ہم کتنا ہی کم کیوں نہ جانتے ہوں، ہمیں قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ازبر رہتا ہے۔ نماز میں سورہ فاتحہ کے بعد کسی نہ کسی سورہ کی تلاوت سے لے کر مختلف مواقع پر آغاز تقریب کو ہی کسی آیات قرآنی ہماری سماعتوں کی آبیاری کرتی رہتی ہیں۔

Scanned by CamScanner

معروف دانشور اور مصنف اشفاق احمد نے ایک بار کہا تھا کہ لوگ قرآن پڑھنے پڑھانے، اس کی تجوید و قراءت سیکھنے سکھانے کی بات کرتے ہیں لیکن میں اُن سے کہتا ہوں کہ ہمارا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں قرآن پڑھنا نہیں آتا یا یہ کہ ہمیں قرآن سمجھ نہیں آتا بلکہ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ قرآن جتنا بھی اور جیسا بھی ہمیں سمجھ آجاتا ہے ہم سے اُس پر عمل نہیں ہو پاتا۔ مثلاً ایک آیت ہے 'قولو للناس حسنا' یعنی لوگوں سے اچھی بات کہو۔ اور کہا آج میری عمر پچھتر برس کی ہو چکی ہے، میں آج تک اس ایک آیت پہ بھی عامل نہیں ہو سکا، میں آج بھی لوگوں سے اچھی بات کہنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا۔

اُن کی اس بات کا احساس ہم میں سے کم ہی لوگوں کو ہوتا ہے۔ قرآن فہمی اور اس پہ عمل پیرا ہونے کی خواہش رکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے پر سچ مچ آمادہ ہو کر اس کے لئے کچھ عملی اقدام بھی کریں۔ اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم طالب علمانہ انداز میں قلم اور کاغذ لے کر بیٹھیں۔ کاغذ کے ایک طرف قرآنی اوامر (Do's) اور دوسری طرف نواہی (Don'ts) کی فہرست مرتب کریں۔ قرآن پڑھتے جائیں اور اپنے الفاظ میں یہ نوٹ کرتے جائیں کہ قرآن کن کن باتوں کے کرنے کا حکم دے رہا ہے اور کن کن باتوں سے منع کر رہا ہے۔ قرآنِ حکیم میں جو احکامات بار بار بیان ہوئے ہیں اُن کو فہرست میں بار بار شامل کرنے کی بجائے اُن کو محض ایک ہی بار لکھنا کافی رہے گا۔ اس کام میں آپ ایک پورا دن صرف کریں یا اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے ہفتے بھر میں مکمل کر لیں۔

اس دوران بعض ایسے مقامات بھی آتے ہیں کہ انسان یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتا کہ یہ جو بات کہی جا رہی ہے یہ امرِ الٰہی ہے یا کہ بیان کردہ بات سے منع کیا جا رہا ہے۔ مثلاً انسان کے حوالے سے ان الانسان ظلوما جھولا، ان الانسان عجولا، ان الانسان لربہ لکنود جیسی آیات پڑھ کر یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ بے شک

Scanned by CamScanner

انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے، بے شک انسان بہت ہی عجلت پسند ہے، بے شک انسان اپنے رب کا بہت ہی ناشکر گزار ہے، تو اس سے کیا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ انسان کو ظلم ہی کرتے رہنا چاہیئے، انسان کو جاہل ہی رہنا چاہیئے، انسان کو جلد بازی کا ہی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ اس لئے ایسے مقامات پہ جہاں بات کے دونوں ہی زاویے نکل سکتے ہوں، مزید احتیاط سے اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس بات سے اللہ تعالیٰ کا حقیقی منشا کیا ہے؟ ظاہری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ بات اس لئے تو ہرگز بھی نہیں کہہ رہا کہ انسان اس پہ قائم ہی رہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو جس انداز میں کہہ رہا ہے، اس کو دھیان میں رکھتے ہوئے، کسی بات کا کوئی ایسا مطلب نہیں لینا چاہیئے جو قرآن حکیم کی عمومی تعلیمات کے برعکس اور الٹ ہو۔ کیونکہ قرآن میں نہ تو کوئی تضاد ہے اور نہ ہی کوئی ٹکراؤ۔ اگر کسی جگہ ہمیں ایسا ویسا کچھ محسوس بھی ہوتا ہو تو ہمیں اس کی بابت اپنی سمجھ اور فہم کو بڑھانا چاہیئے اور اپنی فکر اور سوچ کو وسعت دینے کی تگ و دو کرنا چاہیئے۔

اب ایک ایسی تفصیل آپ کے سامنے ہے جو آپ نے خود کلام پاک سے اخذ کی ہے۔ اس فہرست کے مطابق کرنے کے کاموں پہ طبیعت کو آمادہ کرنے اور اُن پہ کاربند ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کاموں سے باز رہنے کی کوشش کی جائے جن سے قرآن منع کرتا ہے تو زندگی میں قرآنی تعلیمات کی برکات سے مستفیض ہونے کی راہیں کھل سکتی ہیں۔ اس بات پہ عمل پیرا ہونے کی خواہش جس قدر توانا اور طاقت ور ہوگی اسی قدر اس کام میں کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ اس دوران یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس تفصیل کے مطابق کبھی کرنے کا کوئی کام کرنے سے رہ جائے یا کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے جس کی ممانعت کی گئی ہو تو دل برداشتہ ہونے کی بجائے، آئندہ محتاط رہنے کا عہد کرتے ہوئے، اپنے پروگرام پہ کاربند رہنا چاہیئے۔

اس پروگرام پہ عمل کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اپنی تیار کردہ فہرست پہ اس زاویے سے غور کیا جائے کہ قرآنی اوامر و نواہی کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی کیا حکمتیں مستور ہیں۔

Scanned by CamScanner

ظاہر ہے کہ اگر انسان اُن باتوں سے پرہیز کرے گا جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے یا اُن باتوں پہ عمل کرے جن باتوں کی اُس کو تاکید کی گئی ہے تو اس کا فائدہ کس کو ہوگا۔ ذاتِ باری تعالیٰ تو کسی بھی قسم کے فائدے اور نقصان کی حدوں سے ماوراء، ارفع اور اعلیٰ ہے۔ جب ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ جن باتوں کے کرنے اور نہ کرنے کا فرما رہا ہے اُن کے تمام فوائد انسان ہی کے لئے ہیں تو طبیعت اس پروگرام پہ زیادہ دلجمعی سے عمل پیرا ہونے پر آمادہ ہو سکتی ہے۔ کسی بھی پروگرام پہ عمل کرنے میں طبیعت کی آمادگی ہی مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ جب یہ مرحلہ بسہولت طے کر لیا جائے تو باقی کام استاد شوار نہیں رہتا۔

پروگرام کے اس مرحلے پر خود احتسابی کا طریقہ اختیار کرنے سے اس کے یقینی فوائد نہ صرف دو چند ہو جاتے ہیں بلکہ انسان کے ان اوامر و نواہی کے پس پردہ حکمتوں سے روشناس ہونے کے امکانات کہیں زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ خود احتسابی کے لئے رات کو سونے کے لئے بستر میں لیٹنے سے پہلے، آرام دہ نشست میں بیٹھ کر، دن بھر کے کئے گئے کاموں اور اپنی کہی گئی باتوں پہ اس حوالے سے سوچا جائے کہ آج میرے کون کون سے قول و فعل قرآن کے اوامر و نواہی سے ٹکراتے رہے یا اُن کے مطابق رہے۔

اس کے لئے اگر باقاعدہ طور پر یہ اہتمام کر لیا جائے کہ اوامر و نواہی Do's & (Don'ts) کی اپنی تیار کردہ فہرست کو سامنے رکھ کر، دس تا پندرہ منٹ اس پہ اپنی دن بھر کی کارکردگی کے حوالے سے، یہ سوچا جائے کہ آج تمام دن مجھ سے کوئی ایسی بات سرزد تو نہیں ہوئی جو اس لسٹ سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ وہ کون کون سی بات ہے جو میں کر سکتا تھا لیکن مجھ سے ہو نہیں سکی یا اگر ہوئی تو وہ اُس قدر اچھی طرح سے نہیں ہوئی جس قدر بہتر طور پر میں اسے سرانجام دے سکتا تھا۔

جن جن باتوں پہ یہ محسوس ہو کہ وہ اس معیار کے مطابق نہیں تھیں یا اُن میں بہتری کی مزید گنجائش رہ گئی ہے، اُن کی بابت اپنے ذہن میں یہ طے کر لیں کہ کل سے اس قسم کی

Scanned by CamScanner

کوتاہی سرزد نہیں ہونے دوں گا/گی۔ مثلاً آپ نے دیکھا کہ آج فلاں موقعے پر میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا/سکی اور مجھے غصہ آ گیا تھا۔ آپ اپنے ذہن میں اس بات کا خوب اطمینان سے حساب لگائیں کہ اُس وقت آپ غصے سے کیسے بچ سکتے تھے۔ اس بات پہ خود کو شیطان کا شکار نہ ہونے دیں کہ میں حق پر تھا/تھی، اس لئے غصہ آنا ایک فطری امر تھا۔ یاد رکھیں اگر غصہ فطری ہوتا تو اللہ اس سے بچنے والوں کو اپنا محبوب قرار نہ دیتا۔ اس طرح سے اس پروگرام پر عمل پیرا رہ کر، ایک دو ماہ کی مشق سے آپ اپنی بہت سی کمزوریوں اور خامیوں پر قابو پا سکتے ہیں اور اپنی زندگی کو قرآنی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔

اس پروگرام کی خاص بات یہ ہے کہ اس پہ عملدرآمد بھی آپ نے خود ہی کرنا ہے اور اس کی نگرانی کا فریضہ بھی خود آپ ہی کو سرانجام دینا ہے۔ اگر آپ نے خود اپنی نگرانی کرنے میں کوئی کوتاہی کی تو آپ اس پروگرام کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکیں گے اور یہ سارا پروگرام ادھورا ہی رہ جائے گا۔ جب اس پروگرام پہ مکمل طور پر عمل ہی نہ ہوا تو اس کے نتائج بھی ادھورے ہی مرتب ہوں گے۔ کیونکہ اللہ کے قوانین کسی بھی کام کا پورا معاوضہ دینے کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ اس لئے ادھورے کام سے پورے نتائج برآمد ہونے کی توقع ایک ایسی خام خیالی کے علاوہ اور کچھ نہیں جس کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔

ان اوامر و نواہی پہ غور کریں تو ان کو تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم کے اوامر و نواہی وہ ہیں جن کا تعلق عبادات سے ہے۔ مثلاً قیام الصلوٰۃ، ادائیگی زکوٰۃ، روزہ، حج، صدقات، تلاوتِ کلامِ پاک اور ذکر و تسبیح وغیرہ۔ دوسری قسم وہ ہے جن کا تعلق معاشرتی نظام سے ہے۔ ان میں صلہ رحمی، طعام المساکین، شادی اور طلاق کے معاملات، عزیز و اقربا سے حسن سلوک، لین دین کے وقت گواہان کا تقرر، فحاشی سے بچنا، قتل نہ کرنا، برائی کا بدلہ نہ لینے کی تلقین، حرمتِ سود وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ تیسری قسم کے اوامر و نواہی کا تعلق انسان کی شخصیت، ذہنی اور روحانی تربیت سے جڑا ہوا ہے۔ مثلاً جھوٹ نہ بولنا، غصہ کی

Scanned by CamScanner

ممانعت، غضِ بصر کا حکم، شک اور وسواس سے بچنا، غیبت نہ کرنا، چغلی نہ کرنا، علم وحکمت کا حصول، لوگوں سے اچھی بات کہنا، غور وفکر کرنا، یک سوئی سے اپنے رب کی طرف متوجہ رہنا وغیرہ۔

مسلمانوں کے عمومی طرزِ عمل کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا رجحان زیادہ تر پہلی قسم کے اوامر ونواہی کے اتباع تک محدود ہے۔ دوسری قسم کے اوامر ونواہی کی پابندی ہم کم کم ہی کر پاتے ہیں جبکہ تیسری قسم کے اوامر ونواہی کے اتباع اور پابندی کے لحاظ سے ہم بہت ہی پیچھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بحیثیت امت مسلمہ اپنا تشخص تو رکھتے ہیں لیکن اچھے انسان ہونے کے شرف سے سرفراز ہونے سے محروم ہیں۔ اب اگر ایک مسلمان نماز بھی پڑھتا ہے اور اور جھوٹ بھی بولتا ہے، زکوٰۃ بھی دیتا ہے لیکن غصے پہ اس کو کوئی قابو نہیں، روزے تو رکھتا ہے لیکن شک اور بے یقینی اس کی رگوں میں زہر گھولے رہتی ہے، حج کرنا سعادتِ ازلی سمجھتا ہے لیکن غیبت سے باز آنا دشوار جانتا ہے، تلاوت کلامِ پاک اس کے روزمرہ کے معمولات میں شامل ہے لیکن وہ علم وحکمت سے کوسوں دور ہو تو انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم اس کو کوئی اچھا مسلمان ماننے میں متامل ہی رہیں گے۔

یعنی جب تک ہم اسلام کو جزوی طور اپنائے رکھیں گے ہم اقوامِ عالم میں اسی طرح شرمندہ وخوار اور زبوں حال رہیں گے جیسا کہ آج کی دنیا میں مسلمانوں کو سمجھا جا رہا ہے یا زیادہ درست الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جیسا کہ وہ ہیں۔ اسلام کو جب تک ہم پورے طور پر نہیں اپنائیں گے، اس کے فیوض وبرکات سے پوری طرح کیسے مستفیض ہو سکتے ہیں؟ کسی بھی نظام کو ادھورے پن سے نیم دلی سے اپنانے اور اسی نظام کو مکمل طور پر دلجمعی سے اپنانے میں جو فرق ہے وہ کسی بھی صاحبِ عقل ونظر سے مخفی اور پوشیدہ نہیں۔ تو پھر ہم اس طرف کیوں نہیں آتے کہ ہم اسلام میں پوری طرح داخل ہو جائیں جبکہ ہم اس کو ایک مکمل ضابطہ حیات مانتے بھی ہیں اور کہتے بھی ہیں؟

کوئی عقل ودانش سے عاری انسان ہی یہ سمجھ سکتا ہے کہ تعلیماتِ اسلام وقرآن پہ

Scanned by CamScanner

جزوی اور سطحی طور پر استفادہ کر کے اُس کو پورے فوائد وثمرات حاصل ہو سکیں گے۔ جب ہم قرآنی اوامر ونواہی کے ایک حصے پر عمل کرتے ہیں تو ہم اس کے عطا کردہ نظام کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں اور جب ہم اس کے دوسرے حصے کو بھی اپنا لیتے ہیں تو اُس لباس میں جسم کی تخلیق بھی ہو جاتی ہے لیکن اس جسم میں روح اسی وقت داخل ہو سکتی ہے جب ہم اس نظام کے تیسرے حصے کو پوری طرح خود پہ نافذ کر سکیں۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے کارناموں پہ فخر اور ماضی کی شاندار رویات کے امین ہونے کا دعویٰ ہمارے ذہنوں پہ خمار کی طرح سوار ہے۔ ہم پدرم سلطان بود کے اس خمار کی دھند سے نکل کر جب بھی کبھی یہ سوچنے کی زحمت اٹھا سکیں گے کہ اگر وہ لوگ بڑے تھے تو کیوں؟ اور ہم اُن کی طرح بڑے نہیں بن سکے تو کیوں؟ تب یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ہم اسلام کی اصل روح کو خود پہ طاری اور جاری کر سکیں۔

Scanned by CamScanner

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ

الرَّجِيْمِ

قرآنِ حکیم کے احکامات میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ آغازِ تلاوت پہ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کیا کرو۔ سورہ نحل کی آیت ۹۸ میں ارشادِ رب الرحیم ہے۔ 'سو جب تم قرآن کی قرات کیا کرو تو شیطان مردود کے خلاف، اللہ کی پناہ لیا کرو۔' اس حکم کی حکمتوں پہ غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم شیطان کی بابت اپنے تصورات کو احتیاط اور باریک بینی سے واضح کر لیں اور اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھیں کہ اللہ کی پناہ لینے سے اصل میں کیا مراد ہے اور یہ کیسے اور کیونکر لی جا سکتی ہے؟

غور کا آغاز کرنے کو ہم پناہ لینے کے عمل کا جائزہ لیں تو ہمارے ذہن میں اس کے مروجہ مفہوم کے مطابق کسی خطرے سے بچنے کے لئے پناہ لینا آتا ہے۔ بچے کا کسی بات سے سہم کر اپنی ماں کی طرف دوڑنا، کسی مصیبت کے وقت کسی محفوظ جگہ پہنچنا یا یہ کہ کسی طاقتور کی طرف رجوع کرنا تاکہ وہ امکانی خطرے کے خلاف اپنی پناہ میں لے سکے۔ ان سب مفاہیم سے ہم نا آشنا نہیں ہیں۔ اس پہ مزید غور و فکر کیا جائے تو پناہ لینے کے عمل میں کسی خطرے کا

Scanned by CamScanner

ڈر، اور پناہ دینے والے سے کوئی قریبی تعلق بنیادی اجزا شمار کیے جاسکتے ہیں۔ یعنی پناہ لینے کی خواہش اُسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب کسی مصیبت یا خطرے کا سامنا ہو اور پھر پناہ کے لئے اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس سے کم از کم اتنا تعلق تو ہو کہ وہ آپ کو جانتا ہو اور آپ کو اپنی پناہ میں لینے پر آمادہ بھی ہو۔ خطرے کا واضح احساس، پناہ دینے والے سے کوئی نسبت اور پناہ دینے کی قابلیت، اہلیت اور آمادگی نہ ہو تو پناہ کا عمل مکمل نہیں ہوسکتا۔

قبائلی طرزِ معاشرت میں جب کسی کو اپنے دشمن سے خطرہ محسوس ہوتا ہے اور وہ خود کو اس خطرے کا سامنا کرنے کے لائق نہیں سمجھتا، تو وہ قبیلے کے کسی طاقتور شخص، ملک، سردار یا رئیس سے پناہ کی درخواست کرتا ہے۔ جو سب سے پہلے تو یہ دیکھتا ہے کہ پناہ طلب کرنے والا ہے کون؟ کیا وہ اس کو جانتا ہے؟ اگر خود نہیں جانتا تو کیا اس کے جاننے والوں میں سے کوئی اُس کو جانتا ہے؟ پھر وہ یہ جانچتا ہے کہ پناہ طلب کرنے والے کو درپیش خطرے کی اصل نوعیت کیا ہے؟ اس سے وہ اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کیا وہ اس خطرے کے خلاف دفاع بن بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے بعد وہ یہ اندازہ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اگر وہ اس کو پناہ دے گا تو اس کام کا اُس کو کیا فائدہ ہوگا؟ اب یہ فائدہ اللہ کی رضا سے لے کر مالی منفعت یا بدلے میں کوئی خدمت وغیرہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر پناہ دینے سے پہلے پناہ دینے والا کم و بیش چھ پہلوؤں سے اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ اس کو پناہ دینی بھی چاہئے یا نہیں؟ یعنی پناہ طلب کرنے والے کے پاس اُس کو مطمئن کرنے کے لئے ان تمام باتوں کے شافی جواب ہونا ضروری ہوتے ہیں۔

اس بات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہم اللہ تبارک وتعالیٰ سے پناہ کے طلب گار تو ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک بھی بات کا کوئی قابلِ اطمینان جواب ہمارے پاس نہیں ہوتا۔ کیا ہم اللہ کو جانتے ہیں؟ اب اس بات کا جواب اگر ایمانداری سے دیا جائے تو بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لیکن فرض کیا کہ ہم کہنے کو کہہ دیتے ہیں، جی ہاں ہم اُس کو جانتے ہیں

Scanned by CamScanner

تبھی تو اُس سے پناہ مانگ رہے ہیں۔لیکن یاد رہے کہ پناہ مانگنے والے کا جاننا اور پناہ دینے والے کا جاننا، دو مختلف باتیں ہیں۔یعنی پناہ دینے والا ہم سے کس قدر اور کتنا واقف ہے؟ اگر وہ خود واقف نہ ہو تو کوئی ضمانتی یا شافع درمیان میں ہے یا نہیں؟ اب کج بحثی کو ہم یہ کہہ دیں کہ اللہ ہمارا خالق ہے، ہمارا رب ہے، وہ ہمیں نہیں جانتا تو پھر ہمیں اور کون جان سکتا ہے؟ اس بات میں تو کوئی شک وشبہ ہی نہیں کہ اللہ احسن الخالقین اور رب الالعالمین ہونے کے ناتے ہمیں بطور اپنی مخلوق کے خوب جانتا ہے۔لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ ہم سے اس کے ساتھ تعلق میں کوئی ایسی بات ہے کہ وہ ہمیں اپنی پناہ میں لینے پر بخوشی آمادہ ہو۔ورنہ تو قبیلے کا سردار ہونے کے ناتے وہ شخص بھی یہ تو جانتا ہی ہے کہ وہ بندہ اُس سے کس نسبت سے بات کر رہا ہے۔لیکن وہ تو اس سے بڑھ کر کچھ اور بات پوچھتا ہے۔

دوسرا سوال کہ خطرے کی اصل نوعیت کیا ہے؟ ہمیں شیطان سے کیا خطرہ ہے؟ کیا ہم نے اُس کا کچھ ایسا بگاڑا ہے کہ وہ ہمارا دشمن ہو گیا ہے؟ اس بات کو غیر جانبداری اور تلاش حق کے جذبے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس وقت جو صورت حال ہے، وہ تو کچھ ایسی ہے کہ ہم سب کچھ وہی اور ویسے ہی تو کر رہے ہیں جو ہم سے شیطان کروانا چاہتا ہے۔جھوٹ بولنا، اگر جھوٹ سے اجتناب ہو بھی جائے تو غلط بیانی سے نہ بچنا، ہر وقت غصے سے تلملائے رہنا، دوسروں کو حقیر ہی نہیں قابل نفرت سمجھنا، ہر وقت اور ہمہ وقت اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں سرگرداں رہنا، زاہد شب زندہ دار بنیں گے لیکن حسنِ اخلاق اور شفقت سے ہاتھ دھو کر، نیکی کا کوئی چھوٹا سا کام سرزد ہو جائے تو اس کا اعلان ہی نہیں تشہیر ضروری، اپنی بڑائی اور برتری کو قائم کرنے کی تگ ودو میں مصروفیت کا یہ عالم کہ اللہ کی بڑائی اور کبریائی کا زبانی اقرار بھی ہمارے اندر اس بات کا اتنا بھی احساس اجاگر نہیں کر پاتا کہ کم از کم دورانِ نماز، جب ہم منہ سے اللہ اکبر کہہ دیں تو کوئی دوسری بات ذہن میں نہ آنے دیں، اور تو اور سود کو حرام بھی مانتے ہیں اور بینکوں کے کرم فرما بھی بنتے ہیں۔الغرض ہمارا کون سا

Scanned by CamScanner

عمل ایسا ہے جس سے جناب شیطان ہم سے اتنے عاجز اور تنگ آجائیں کہ ہمارے دشمن بن کر ہمیں نقصان پہنچانے پر اتر آئیں۔ ایمانداری سے دیکھا جائے تو ہمارے اعمال ایسے ہیں کہ وہ اللہ کی ناراضگی اور عتاب کو تو دعوت دیتے ہیں لیکن شیطان کو ہماری طرف متوجہ تک کرنے کے قابل بھی نہیں۔ شیطان اُن سے کیا پرخاش رکھے گا جن کے اپنے اعمال ہی انہیں اللہ سے دور کئے ہوئے ہوں۔ وہ تو صرف اُن کا دشمن ہے جو اللہ کی طرف ہیں، اللہ کو جانتے ہیں، اور کوئی ایسا کام کرنا اس لئے گوارا نہیں کرتے کہ اُن کے دوست اللہ سے اُن کی دوستی میں فرق نہ آجائے۔ جن کی بابت اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، اُن کے نزدیک اللہ سے ڈرنے کا مفہوم اُس سے خوفزدہ ہونا نہیں ہوتا بلکہ انہیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں بے احتیاطی سے وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دیں یا کر نہ بیٹھیں جس سے اُن کی اللہ کے ساتھ دوستی یا ربط اور تعلق میں کوئی دراڑ پڑ سکتی ہو۔ جن لوگوں کا تعلق اللہ سے جڑ جاتا ہے اور پھر جڑا بھی رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کو شیطان ناپسند کرتا ہے اور انہیں اللہ کی طرف سے موڑنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

اب یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ شیطان اصل میں ہے کیا اور اس کو مردود کہنے کا اصل مفہوم کیا بنتا ہے؟ کلام مجید میں لفظ شیطان، واحد اور جمع دونوں صورتوں میں کل اٹھاسی (۸۸) مرتبہ اور ابلیس کا لفظ گیارہ (۱۱) بار استعمال ہوا ہے۔ تعوذ کے الفاظ قرآن حکیم کے حکم کے مطابق، قرآن پڑھنے، اس کی تلاوت کرنے، اس کی قرات کرنے اور اس پہ غور و فکر کا آغاز کرنے سے پہلے کہنا فرض ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے فرمان کی روشنی میں، شیطان کو سمجھنے کے لئے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ اصل میں ہے کیا؟

قرآن میں بیان ہوتا ہے۔ اللہ نے آدمؑ کو علم الاسماء عطا کئے۔ اس کے بعد اُن کو اُن علوم کے اظہار کا کہا گیا۔ جب آدمؑ نے ان علوم کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اپنی اطاعت کا اظہار کریں۔ تمام فرشتوں نے اس حکم کو

Scanned by CamScanner

بلا چوں و چراں مان لیا، سوائے ابلیس کے۔ اُس نے تکبر اور رعونت سے کام لیتے ہوئے، اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پہ اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ وہ اپنے زوج کے ہمراہ جنت میں داخل ہو کر وہاں رہیں اور جہاں سے جو جی چاہے، خوشی اور رغبت کے ساتھ کھائیں۔ لیکن ایک مخصوص درخت کے قریب بھی نہ جائیں ورنہ اُن کا شمار ظالموں میں ہو جائے گا۔ پھر شیطان نے انہیں بہکا دیا اور جس آرام اور مزے میں تھے اس سے انہیں نکلوا دیا۔

ہبوطِ آدم کے اس واقعے میں یوں تو بہت سی باتیں ہیں جن پر الگ سے غور و فکر کیا جانا لازم ہے لیکن اس وقت نوٹ کرنے کی بات ہے کہ قرآن انکار کا مرتکب ہونے والے کو ابلیس اور بہکانے والے کو شیطان کہہ رہا ہے۔ بہکانے والے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ابلیس نے انہیں بہکایا اور مزے کی زندگی سے نکلوایا بلکہ اُس کے لئے ایک الگ لفظ شیطان استعمال فرمایا۔ اس کے علاوہ قرآن میں ابلیس کی چالوں سے بچنے اور اس کے نقشِ قدم پہ چلنے سے منع کرنے کی بجائے ہر جگہ شیطان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس نکتے پہ غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ابلیس کی وہ طرزِ فکر جو حکمِ عدولی کے بعد بنی اور اُس نے دوسروں کو گمراہ کرنے کا سامان کیا، اللہ تعالیٰ ایسی صفات اور اس منفی طرزِ فکر کے حامل تشخص اور مظہر کو شیطان کے نام سے متعارف کرواتا ہے۔

شیطان ہو یا ابلیس، یہ وہ صفات اور طرزِ فکر و عمل ہیں جن کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا اور انہیں رد کر دیا، اس کو اپنانے یا اس طرزِ فکر پہ کاربند ہونے سے منع کر دیا۔ رد کرنے کے لئے نہایت سخت اور تعزیری لفظ 'رجیم' کا استعمال اس بات کی علامت ہے کہ اس کو اپنانے سے ہر ممکن بچنا اور پرہیز کرنا ضروری ہے۔ رجم کرنا اسلامی تعزیر کے مطابق سنگسار کرنے یعنی پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دینے کو کہا جاتا ہے۔ اس بات سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ شیطان کی طرزِ فکر و عمل یعنی شیطنت کو کس درجے پہ دفن فرما رہا ہے۔

اس تمام سوچ بچار کے بعد جب ہم تعوذ کے الفاظ اور قراتِ قرآن سے پہلے

Scanned by CamScanner

اس کی فرضیت کے حکم پہ غور کرتے ہیں تو یہ عقدہ کھلتا ہے کہ جب الفاظ قرآنی کو پڑھنے اور سننے کے دوران، دھیان ان الفاظ کی معنویت کی طرف مرکوز رکھا جاتا ہے تو قرآن کی نورانیت کے زیر اثر ذہن میں خیالات کی بہت سی لہریں دور کرتی ہیں۔ اس وقت بات سمجھنے میں کوتاہی ہونے سے بات کا پورا مفہوم خبط ہو کر رہ جاتا ہے۔ بات کو اپنی ذات کے حوالوں سے، اپنے محدود علم کی روشنی میں جانچنے سے انسان کے بھٹکنے اور بہکنے کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس طرف متوجہ کرنے اور انہیں چوکس کرنے کے لئے اُن پہ تعوذ یعنی اللہ کی پناہ طلب کرنا فرض کر رہا ہے۔ شیطانی طرزوں سے محفوظ رہنے اور رحمانی طرزوں کو اپنانے کے لئے توجہ کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ منتشر، بھٹکتی اور بہکتی توجہ کی بجائے، یکسو، مرتکز و مرکوز توجہ سے جو بھی کام کیا جاتا ہے اس میں کامیابی کا حاصل ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔

جب انسان اپنے ذہن میں ابھرنے والے خیالات کو اس زاویے سے جانچتا ہے کہ ان میں سے کونسا خیال ایسا ہے جس کو اللہ کے دربار میں شرف قبولیت سے نوازا جائے گا اور وہ کونسی بات ہے جس کو اللہ تعالیٰ رد فرما دیں گے تو مان لینا چاہیئے کہ اس بندے نے اللہ سے پناہ مانگنے کی شرائط کو پورا کرنے کی سعی کی ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان شیطان کو جنات میں سے ایک فرد مان کر اس سے تو بچنا چاہے لیکن اس کی طرزوں سے پرہیز کی طرف توجہ نہ دے، تو اس کی کامیابی کا امکانات کم ہی ہوں گے۔ اسی طرح جب کوئی بندہ شیطان کے ساتھ ساتھ شیطنت یعنی اس کی طرز فکر و عمل سے بھی بچنے کی تگ و دو کرتا ہے تو اس کی کامیابی کی امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے اُس کی حکم عدولی کی بابت دریافت کیا کہ حکم کی بجا آوری میں اُس کو کیا امر مانع ہوا؟ تو اُس نے کہا کہ میں انسان سے افضل اور برتر ہوں، کیونکہ تو نے اُس کو سڑی ہوئی مٹی کے گارے سے تخلیق کیا، جب کہ میری تخلیق آگ (جیسی

Scanned by CamScanner

صاف ستھری چیز) سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس سے یہ نہیں کہا کہ تو غلط کہتا ہے۔ اللہ نے یہ کہا کہ اُس نے استکبار کیا اور رعونت کا اختیار کی۔ اور پھر ہمیں بتایا کہ اس کو مردود قرار دیا گیا۔ ان باتوں پہ غور کرنے کے لئے ہمیں اپنے ذہن میں اس منظر کو سامنے لانے کے لئے اپنے تصور کو حرکت میں لا کر یہ سوچنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کس بنیاد پہ اُس کو رعونت اور تکبر کا مرتکب جان کر مردود قرار دے رہا ہے۔ ابلیس کے تکبر اور رعونت کی وجہ معلم الملکوت ہونے کے باوجود بصیرت کی کمی اور نا سمجھی ہی تو تھی۔ اُس نے آدم کی تخلیق کے مظاہراتی پہلو یعنی اس کو مٹی سے تخلیق کیا جانا تو دیکھا لیکن یہ نہ دیکھا کہ اُس مٹی میں اللہ تعالیٰ اپنی روح میں سے روح پھونک رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ آدمؑ کے اندر منجانب اللہ آنے والی روح کا ادراک کرنے میں ناکام رہا بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے اللہ کے حکم کو پائے حقارت سے ٹھکرانے کی گستاخی بھی کی۔ نہ صرف یہ کہ گستاخی کی بلکہ اپنی گستاخی کو جائز قرار دینے کو اس کی توجیہہ دینے بیٹھ گیا۔ اس بے بصیرتی، نا سمجھی اور حسد کی جلن نے اُس کو پہلے تو حکم عدولی اور پھر گستاخی کا مرتکب بنا دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اُس کو انکاری جان لیا اور اس کے انکار کے سبب اُس کو مردود قرار دے دیا تو بجائے اس کے کہ وہ شرمندہ ہوتا۔ اُس نے کہا۔ بما اغویتنی یعنی اُس کو دھوکا دیا گیا ہے۔ اور اللہ سے کہا۔ تو دیکھ کہ اب میں تیرے بندوں کو کس طرح سے گمراہ کروں گا۔ اس پر باری تعالیٰ نے فرمایا کہ جو میرے بندے ہوں گے وہ تیرے جال میں نہیں آئیں گے لیکن جو تیری باتوں میں آ کر تیرے نقش قدم پہ چلیں گے میں اُن سب کو تجھ سمیت جہنم میں جھونک دوں گا۔

ان باتوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ابلیس کو شیطنت کا مرتکب پا کر اللہ اُس کو شیطان قرار دے دیتا ہے۔ شیطنت کے اجزائے ترکیبی کا واضح اور دو ٹوک ادراک کئے بغیر ہم شیطنت کے اُن اجزاء کو اپنی سوچوں میں شامل ہونے سے کبھی نہیں روک سکتے۔ اپنے علم کے زعم میں اتنا اندھا ہو جانا کہ درست اور صحیح بات بھی سمجھ میں نہ آئے، بے بصیرتی ہے ایک بات کرنے کو کی جائے اور اُس کو کرنے میں اپنا ہی بھلا ہو لیکن پھر بھی نہ کی جائے، نا سمجھی ہے۔ جب کسی کا

Scanned by CamScanner

بھلا ہو تو بُرا لگے، یہ حسد ہے۔ جب انکار کی، حکم عدولی کی وجہ پوچھی جائے تو اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لینے کی بجائے، اس کی تشریح اور توجیہہ کرنے اور بہانے تراشنے کی کوشش کرنا، گستاخی ہے۔ جب گستاخی کی سزا ملے، تو غصہ آنا اور اس غصے میں اپنے محسن، مشفق رب کی عنایتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے انتقامی جذبات کا اظہار کرنا اور انتقام میں تخریب پر اتر آنا سوائے شیطنت کے اور کیا کہلا سکتا ہے؟

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر ہم تعوذ کی حکمت پہ غور کریں گے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کس طرح کے طرزِ عمل کا متقاضی ہے۔ اس تمام غور و فکر کا حاصل یہ بنتا ہے کہ دراصل تعوذ ہمارے اندر نصب اُس چھلنی کے نظام کو متحرک کرنے کا نام ہے جو ہمارے افکار و خیالات میں گھلی شیطنت کو چھانتی اور ہمیں شیطانی طرزوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ تعوذ کی باطنی تفسیر یہ ہے کہ ہر قدم پہ، ہر خیال کو اس زاویے سے جانچا جائے کہ کیا وہ قدم یا وہ خیال بارگاہِ رب العزت میں قبول ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر اللہ کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق، بارگاہِ الٰہی میں قبول کیے جانے کی بجائے اس کے رد ہونے کا امکان ہو تو اُس سے بچا جائے۔ اگر تعوذ پڑھنے کے باوجود ہمارے اندر موجود فلٹر کرنے والا نظام متحرک نہیں ہوا تو ہم نے تعوذ کے الفاظ کو زبان سے ادا تو کیا لیکن اُن کے نورانی میکانزم کی برکات سے استفادہ کرنے سے محروم ہی رہے۔

اس ہی بات کو واضح کرنے کو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہر انسان کے ساتھ اس کا شیطان لگا ہوا ہے اور اُس کو قابو میں رکھنے والے ہی فلاح پاتے ہیں۔ یعنی ہر انسان کے اندر منفی اور مثبت طرزیں موجود ہوتی ہیں۔ یہ خود انسان پہ منحصر ہے کہ وہ منفی طرزوں کو خود پہ حاوی ہونے دیتا ہے یا نہیں۔ خود کو منفی طرزوں سے بچانے کے لئے جس تربیت اور خود احتسابی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے حصول اور خود پہ اس کے نفاذ کی کوشش کے بغیر یہ سمجھنا کہ محض اعوذ باللہ کہہ دینے سے ہم نے اپنی گاڑی کا کانٹا بدل لیا ہے اور اب یہ مثبت پٹری پر ہی گامزن رہے گی، اک خام خیالی ہی ہو سکتی ہے۔

Scanned by CamScanner

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

سورۂ قمر میں اللہ رب کریم کا چھ مرتبہ دہرایا گیا یہ ارشاد نہایت معنی خیز ہے۔ 'اور ہم نے آسان کر دیا قرآن کو سمجھنے کے لئے، تو پھر ہے کوئی جو اس کو سمجھے؟' باری تعالیٰ کی اس دعوتِ عام کے بعد بھی اگر کسی کے ذہن میں یہ بات جاگزین رہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے کسی خصوصی صلاحیت اور مخصوص علمی سطح کا حامل ہونا ضروری ہے تو ایسا سمجھنا اللہ تعالیٰ کے فرمان کو جھٹلانے کے مترادف ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

ہم دنیاوی علوم کو سیکھنے کے لئے، روزگار کی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انگریزی سیکھنے میں تو عار محسوس نہیں کرتے لیکن اس الہامی دستاویز کو جو ہماری دنیاوی اور اُخروی زندگی کی فلاح اور بہتری کی ضامن ہے، سمجھنے کے لئے عربی سے اپنی واقفیت کو بڑھانے پہ آمادہ نہیں۔ یہ طرزِ عمل رکھتے ہوئے ہم جب بھی قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں تراجم اور تفاسیر کا سہارا لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ قرآن کے تراجم اور تفاسیر اپنی جگہ قرآن کی ایک ایسی خدمت ہے جس کی تحسین نہ کرنا کفرانِ نعمت سے کم نہیں ہے۔ لیکن اس

Scanned by CamScanner

بات کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ کبھی کسی مترجم اور مفسر نے کیا کہیں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ قرآن کا پورا مفہوم، اور اُس میں بیان کردہ بات کے تمام زاویے اپنے ترجمے یا تفسیر میں بیان کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے یا یہ کہ اُس نے بات کو اُسی طرح سے سمجھ لیا ہے جس طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی بات کو سمجھانا چاہتا ہے۔ جبکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ ہر مترجم اور مفسر نے کمال ایمانداری سے اپنے اس عجز کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ وہ قرآن کی خدمت کے جذبے سے یہ کام کر رہا ہے اور اللہ سے دعا گو ہے کہ اللہ ان کی لغزشوں، کوتاہیوں اور غلطیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اُن کی اس خدمت کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔

اس بات کو ایک اور زاویے سے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآن کی تفہیم کو ایک انفرادی عمل ہونے کے ناتے ایک حد تک تو اُس کو سمجھنے کا دعویٰ جا سکتا ہے لیکن تمام افراد کی فہم کے برابر اور ان کی تمام ضروریات کے حوالے سے اُس کی مکمل تفہیم کے دعویٰ کا نہ تو کوئی سوچ سکتا ہے اور نہ ہی یہ بات محدود شعور کے لئے ممکن ہے۔ اسی سبب سے ایک کے بعد دوسرا ترجمہ اور ایک کے بعد دوسری تفسیر ہوتی رہی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ ہر مترجم اور مفسر اسی وجہ سے اس قدر کٹھن کام کا بیڑا اٹھاتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جو بات اس کی سمجھ میں آئی ہے، اُس سے پیشتر کسی اور کو اس کا دھیان نہیں آ سکا تھا۔ اگر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ یہ بات تسلیم کر لیتے کہ اُن سے پہلے کی گئی تفاسیر جامع اور مکمل ہیں تو وہ تفہیم القرآن کبھی نہ لکھتے۔ اس بات کا ایک ہی مطلب ہے کہ جتنی بات اُن سے پہلے کے مفسرین کے فہم و ادراک میں آ چکی تھی، وہ اُس سے بڑھ کر کچھ بتانا چاہتے تھے۔

اسی لئے علمائے باطن اس بات پہ اصرار کرتے ہیں کہ قرآن کو براہ راست عربی میں سمجھنے کی کوشش ہی احسن ہے۔ قرآن کو کسی بھی ترجمے اور تفسیر سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ قرآن پاک کو سمجھنے کے لئے اس کو عربی ہی میں سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ عربی میں قرآن سمجھنے کے لئے دوران مطالعہ ایک آدھ عربی لغت ساتھ رکھنا کافی سودمند ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اردو

Scanned by CamScanner

جاننے والوں کو عربی سے مانوس ہونے میں زیادہ وقت نہیں ہوتی کیونکہ اردو کی اساس عربی اور فارسی ہی ہے۔ اردو کے بیشتر الفاظ عربی سے لئے گئے ہیں اور اگر تھوڑی سی توجہ سے قرآن کے الفاظ کو دیکھا جائے تو اکثر الفاظ کا استعمال اردو میں بھی رائج مل جاتا ہے۔ شرط وہی ہے کہ توجہ کو قرآن کے الفاظ پر مرکوز اور مرتکز رکھا جائے۔ ارتکاز توجہ سے جب شعور میں یک سوئی پیدا ہونے لگتی ہے اور شعور لاشعور سے متصل ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ الفاظ کا وہ مفہوم ادراک میں منتقل فرما دیتا ہے جو اُس کی مشیت اور منشا کے قریب ہوتا ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں۔ ''صحابہ کرامؓ کے دور اور قرونِ اولیٰ میں جن لوگوں کو مرتبہء احسان حاصل تھا اُن کے لطائف حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کی محبت سے رنگین تھے۔ اُن کی توجہ زیادہ تر حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کے متعلق غور و فکر میں صرف ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے روحانی قدروں کے جائزے زیادہ نہیں لئے کیوں کہ اُن کی روحانی تشنگی حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کے اقوال پر توجہ صرف کرنے سے رفع ہو جاتی تھی۔ ان کو احادیث میں بہت زیادہ شغف تھا۔ اس انہماک کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُن لوگوں کے ذہن میں احادیث کی صحیح ادبیت، ٹھیک ٹھیک مفہوم اور پوری گہرائیاں موجود تھیں۔ احادیث پڑھنے کے بعد اور سننے کے بعد وہ احادیث کے انوار سے پورا استفادہ کرتے تھے۔ اس طرح انہیں الفاظ کے نوری تمثلات کی تلاش کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وہ الفاظ کے نوری تمثلات سے بغیر کسی تعلیم اور بغیر کسی کوشش کے، روشناس تھے۔''

اس بات کو خاص طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ابدال حق حضور قلندر بابا اولیاء نے یہاں توجہ، انہماک اور شغف کے بعد الفاظ کی صحیح ادبیت، ٹھیک ٹھیک مفہوم اور پوری گہرائی موجود ہونے کی بات ارشاد فرمائی ہے۔ کسی بات کو گہرائی میں جا کر سمجھنے کے لئے اس میں ڈوبنا پڑتا ہے۔ کسی شعر کا پورا لطف تبھی آ سکتا ہے جب انسان کا ذہن اس شعر میں ڈوب جائے۔ کیا اس وقت ہمارا ذہن، شعر میں استعمال ہونے والے الفاظ کا مفہوم اس کے عام

Scanned by CamScanner

اور رائج معنی ہی کی حدود میں سمجھ رہا ہوتا ہے یا اس سے کسی قدر بلند ہو کر اس شعر میں پنہاں خیال کو سمجھ رہا ہوتا ہے۔ جب تک کسی شعر میں پیش کردہ خیال ہمارے ادراک کی گرفت میں نہیں آجاتا ہم اس سے پوری طرح محظوظ نہیں ہو سکتے۔ آیاتِ قرآنی کے لئے ہم اتنی سی توجہ کا اہتمام تو کرتے نہیں جتنی ہمیں کسی شعر کو سمجھنے کے لئے درکار ہوتی ہے اور شکوہ کرتے ہیں قرآنی آیات کے سمجھ نہ آنے کا۔ بات یہیں تک نہیں رہتی ہم اس سے آگے بڑھ کر قرآن کو ناقابلِ فہم گردانے سے بھی نہیں چوکتے۔ حالانکہ قرآن خود بتاتا ہے کہ یہ کوئی شاعری نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسا کلام لکھ سکتا ہے اور پھر یہ چیلنج بھی کرتا ہے کہ اس کلام جیسی کوئی ایک آیت ہی لا کر دکھا دے۔ اس بات کا اس کے علاوہ اور کوئی مطلب نہیں ہے کہ جتنا ذوق، شغف اور دھیان شعر و شاعری میں صرف کرنا لازم آتا ہے قرآن اس سے زیادہ ذوق، شغف اور توجہ کا حقدار اور طالب ہے۔

یہ بات اس لئے بھی قرآن کا حق بنتی ہے کہ شعر و شاعری سے تو محض اک ذوق ہی کی تسکین ہوتی ہے جب کہ اس سے ذوق آگہی اور وجدان کی تسکین کے ساتھ ساتھ روحانی تشفی بھی بجھتی ہے اور سوچوں کے زاویے درست ہونے سے عمل کی راہیں بھی استوار ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ معجزہ آفرینی تھی، جس کو دیکھ کر حضرت عمرؓ اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر میں انتہائی طیش کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی بے اختیار پکار اٹھے تھے "میں محمد ﷺ سے خود ملنا چاہتا ہوں۔" اور چل کر دربارِ رسالت میں پیش ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کو اپنی سعادت جانا تھا۔ اسی ذوق، شغف اور حق شناسی کے سبب وہ عشرہ مبشرہ میں بھی گنے گئے اور خلفائے راشدین میں بھی ممتاز ٹھہرے۔

جب انسانی ذہن ذوق، شغف اور دھیان سے آراستہ ہو کر آیاتِ قرآنی میں تجسس کرتا ہے تو قرآن کی نورانیت دھیرے دھیرے انسانی ذہن میں بکھرتی اور اسے پُر افشاں بناتی چلی جاتی ہے۔ جب ذہن انسانی قرآن کے انوار سے سجتا ہے تو انسانی افکار و نظریات

Scanned by CamScanner

اور اعمال خود بخود ہی صالح ہوتے چلے جاتے ہیں۔اس کے لئے الگ سے زور نہیں لگانا پڑتا۔اسی لئے قرآن حکیم "یسرنا القرآن للذکر" کا داعی ہو کر پوچھتا ہے فھل من مدکر' اب یہاں لفظ یسرنا کا مفہوم سہولت اور آسانی کے ساتھ ساتھ سریع التاثر ہونے کی طرف بھی اشارہ کناں ہے اور مدکر سمجھنے، جاننے کی خواہش رکھنے کے علاوہ ادراک رکھنے کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے اور جب ان تمام مطالب اور مفاہیم کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس آیہ کریمہ پر غور کیا جاتا ہے تو یہ محسوس کرنا کچھ زیادہ دشوار نہیں رہتا کہ یہ آیت دعوت کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک وعدہ بھی ہے کہ اگر کوئی خلوص نیت سے قرآن فہمی کی کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کے ادراک کو وسیع کر دیتا ہے اور ذِکر کا لفظ قرآن فہمی کی کوششوں میں تکرار اور اعادہ کو بھی مشروط کرتا ہے۔اس کا مطلب یہی ہوا کہ قرآن فہمی کے لئے اس کی جتنی بار بھی تکرار کی جائے، کم ہی رہتی ہے۔اسی لئے حضور ﷺ نے قیام الصلوٰۃ کے دوران ایک طرف ایک ایک لفظ کی کئی کئی بار تکرار کو لازم کر دیا اور دوسری طرف خود قرآن ترتیل یعنی ٹھہر ٹھہر اور رُک رُک کر پڑھنے کی پابندی عائد کرتا ہے۔یہ سب اہتمام کس لئے تجویز کئے گئے ہیں؟ صرف اور صرف اس لئے کہ انسان انفرادی اور ذاتی طور اُس بات کو سمجھ لے جو اللہ رب العالمین انسان کو ذہن نشین کروانا چاہتا ہے۔اس انفرادی اور ذاتی سمجھ کی خاطر ہی تو قیام اللیل یعنی راتوں کو، تنہائی میں بیٹھ کر، ٹھہر ٹھہر کر، خوب سوچ سمجھ کر، اس میں دل لگا کر غور وفکر کرنے کو قرآن کی تلاوت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہاں پر اس بات کو بھی ذہن نشین کر لیا جائے کہ قرآن حکیم میں کسی بھی لفظ کو اللہ مختلف مطالب کے اظہار کے لئے بھی استعمال فرماتا ہے۔اللہ تعالیٰ جو افکار وخیالات جیسی غیر مرئی چیز سے لے کر ٹھوس مادی اشیاء تک ہر چیز کا خالق ہے، جب کسی لفظ کو بار بار استعمال کرتا ہے، تو انسان اپنے محدود شعور کی وجہ سے اپنی آسانی اور سہولت کے لئے ہر بار سیاق وسباق کے حوالے سے اس میں ایک نیا مفہوم ڈالنے کی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔اس کی

Scanned by CamScanner

یوں تو بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن یہاں ایک دو پر ہی اکتفا کریں گے۔

ایک ہی ترجمے قرآن میں لفظ 'محصنت' کا ترجمہ کبھی تو شادی شدہ عورتیں کیا جاتا ہے، کبھی پاک دامن عورتیں اور کبھی اس سے مراد گھریلو عورتیں لی جاتی ہیں اور کہیں اس کو شریف بیبیوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے تراجم سے اشتباہ اور پیچیدگیاں جنم لے سکتی ہیں اور انہوں نے لیا بھی ہے۔ حضور قلندر بابا اولیاؒ اس قسم کے الجھاوؤں سے بچنے کی یہ ترکیب بتاتے ہیں کہ قرآنِ حکیم میں استعمال ہونے والے الفاظ کی بابت خود قرآن ہی بتاتا ہے کہ کسی خاص لفظ کی بابت اُس کا صحیح اور اصل مدعا کیا ہے۔ اس بات کو پانے کا درست طریقہ یہ ہے کہ یہ تلاش کیا جائے کہ وہ لفظ قرآن میں کن کن صورتوں میں اور کہاں کہاں استعمال ہوا ہے۔ اس کے بعد اُن سب مقامات کے سیاق وسباق کے حوالے سے اس لفظ کا وہ مفہوم اور مطلب تلاش کیا جائے جو ہر جگہ یکساں اور مشترک ہو۔

قرآنِ حکیم میں حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ سے منسوب ایک دُعا ہے۔ ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخسرین ۃ عام طور پر اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا جاتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پہ ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پہ رحم نہ کیا تو ہم گھاٹا کھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ اس ترجمے میں کوئی غلطی نہیں ہے لیکن اگر اس آیہ کریمہ کے اصل مفہوم اور برتر معنویت کی تلاش کرنے کی کوشش میں اس پہ تفکر کیا جائے تو ہمیں جستجو ہوتی ہے کہ حضرت آدمؑ اور بی بی حوا نے اپنی جانوں پہ کیا ظلم کیا تھا؟ انہوں نے اپنی جانوں کو نہ تو قتل کیا تھا اور نہ ہی وہ اس پہ کسی اور قسم کے جبر اور زیادتی کے مرتکب ہوئے تھے۔ تو پھر انہوں نے آخر ایسا کیا کیا تھا جس کے لئے انہوں نے اتنے سخت لفظ 'ظلم' کا استعمال کیا۔ اُن سے جو کچھ ہوا تھا وہ سب ایک غلطی تھی اور اس غلطی کا اعتراف کرنے کو وہ بہت سی صاف بات کہتے تو اُن کو یہی کہنا چاہیئے تھا کہ ہم سے غلطی ہو گئی ہے اور ہم شیطان کے بہکاوے میں آ گئے تھے۔ آپ ہمیں معاف

Scanned by CamScanner

فرمادیں۔ لیکن وہ ایسا ویسا کچھ نہیں کہہ رہے۔ وہ تو کہہ رہے ہیں کہ ہم نے 'ظلم' کیا اور وہ بھی کس پر؟ اپنی ہی جانوں پر۔ اب جب ہم 'ظلم' کا مفہوم اپنی لغت میں تلاش کرتے ہیں تو وہاں سے بھی اسی بات کا پتہ چلتا ہے۔ ظلم کا مطلب زبردستی کرنا، جبر و استحصال، زیادتی کرنا، اندھیر کرنا وغیرہ ہی ہیں۔ جب اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا اور یہ گتھی مزید الجھتی ہے تو ہم اوپر بیان کیے گئے قانون کے مطابق یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن میں یہ لفظ اور کہاں کہاں استعمال ہوا ہے۔

یہاں پر ضمناً اس بات کا تذکرہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا کہ محمد فواد عبدالباقی کی مرتب کردہ اَلْمُعْجَمُ الْمُفَهْرَسُ نامی کتاب، جو مارکیٹ میں عام دستیاب ہے، قرآن پاک کا ایک ایسا اشاریہ ہے جو اس قسم کی تلاش اور ریسرچ میں بہت معاون ہو سکتا ہے۔ اس میں کسی بھی لفظ کے حوالے سے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ مخصوص لفظ قرآن میں کتنی بار استعمال ہوا ہے اور کہاں کہاں مل سکتا ہے۔

تو جب ہم ایسی آیات کی تلاش کرتے ہیں جن میں اس لفظ کو برتا گیا ہو تو ہم اس مشہور آیہ کریمہ تک پہنچ جاتے ہیں جو حضرت یونسؑ سے منسوب ہے یعنی لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنتُ من الظالمین ۃ اس آیت کا معروف ترجمہ تو یہی ہے کہ نہیں کوئی معبود تیرے سوا، پاک ہے تیری ذات اور بے شک میں ہی ہوں جو ظالموں میں سے ہے۔ اب وہی سوال یہاں بھی اٹھتا ہے کہ حضرت یونسؑ جو اللہ کے اُن جلیل القدر انبیاء میں سے ایک ہیں جن کا نام نامی قرآنِ حکیم میں مذکور ہے۔ انہوں نے ایسا کیا کیا جس کو وہ خود ظلم سے تعبیر کرتے ہوئے اپنا شمار ظالموں میں کرنے پر مجبور ہوئے۔ بہت بھی سر ماریں تو ایسا ویسا کچھ معلوم نہیں ہوتا جو ظلم کے معروف مفہوم پر پورا اترتا ہو۔ بہت بھی کہیں تو اُن سے بھی ایک کوتاہی ہی ہوئی کہ اللہ کا حکم آنے سے پیشتر وہ اس بستی سے روانہ ہو گئے جہاں کے لوگوں کو انہوں نے عذابِ الٰہی کی وعید دے دی تھی۔ اب اس بات کی جو بھی توجیہہ کی جائے

Scanned by CamScanner

ظلم کی بات اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ انہوں نے کوتاہی کی بجائے ظلم کا اقرار کیوں کیا؟ عام طور پر ذہن ایسے معاملات میں تساہل اور سہل پسندی کے ہاتھوں وللہ علم بالصواب کی آڑ لے لیتا ہے کہ ہوگا کچھ ہم سے تو اتنا ہی ہو سکتا تھا سو ہم نے کر دیا۔

لیکن جب ہم ذہن کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ مزید کوشش کرے تو ہم اس سیاق وسباق کے حوالے سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن میں ظلم کا لفظ کسی چیز کو اس کی اصل جگہ سے ہٹانے یا غلط سمت میں مبذول کرنے کے مفہوم کا حامل ہے۔ جب اس مفہوم کو سامنے رکھ کر حضرت آدمؑ کی محولہ بالا دعا کا جائزہ لیتے ہیں تو جو بات سامنے آتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ حضرت آدمؑ کی توجہ جو اللہ تعالیٰ کی سمت مرکوز اور مرتکز رہتی تھی، شیطان کے بہکاوے کے سبب اللہ کی طرف سے ہٹ کر شجر ممنوعہ کی طرف مبذول ہو گئی۔ توجہ کے اس ہٹاؤ کے سبب اللہ تعالیٰ کے اس نور کے بہاؤ کا سلسلہ منقطع ہو گیا جو حضرت آدمؑ کی طرف بہہ رہا تھا۔ حضرت آدمؑ اللہ تعالیٰ سے یہی استدعا کرتے ہیں کہ ہمارے انفس یعنی باطن کا برتن آپ کے نور کے دھارے کی زد سے ہٹ گیا تھا، اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور اس نورانی بہاؤ کو دوبارہ ہمارے لئے جاری نہ فرمایا تو ہم بہت ہی بھاری نقصان سے دوچار ہو جائیں گے۔ اسی طرح حضرت یونسؑ بھی اللہ تعالیٰ سے توجہ ہٹ جانے کو جرم مانتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے درخواست فرماتے ہیں کہ کمی بیشی سے تو صرف تیری ہی ذات پاک ہے۔ مجھ سے بشری کمزوری کے سبب توجہ آپ کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس بات پر کہ انہیں اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا ہے، اُن کو مچھلی کے پیٹ سے رہائی بخش دی۔

اب قرآن میں جہاں جہاں ظلم کا لفظ استعمال ہوا ہے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ اللہ رب دو جہاں کی طرف سے توجہ ہٹنا اللہ کے نزدیک ایک ایسا جرم ہے جس کی پکڑ سے نہ تو حضرت آدمؑ بچ سکے اور نہ ہی حضرت یونسؑ۔ اب اس بات کا اندازہ لگائیے کہ توجہ کو اللہ کی طرف سے خود ہٹانا اور ہٹائے ہی رکھنا کتنا بڑا جرم ہوگا اور اس کی تعزیر

Scanned by CamScanner

کیسی کڑی ہوگی؟

اسی آیت میں ایک لفظ 'ترحمنا' بھی استعمال ہوا ہے۔ یعنی ہم پر رحم فرما۔ اگر اس لفظ 'رحم' کو بھی عام اور معروف معنوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یوں لگتا ہے کہ ہم اللہ سے خود پہ ترس کھانے کی استدعا کر رہے ہیں۔ لیکن بالغ نظری سے دیکھا جائے تو پھر رحمت، رحیم اور خاص طور پر رحمۃ اللعالمین کا کیا مطلب لیا جائے گا؟ اگر حضور نبی کریم کی بابت اللہ رب ذوالجلال یہ فرما رہا ہے کہ ہم نے آپ کو نہیں بھیجا سوائے اس کے کہ آپ تمام جہانوں کے لئے رحمت ہیں۔ تو اب اگر اس کا مفہوم 'ترس کھانا' ہی لیا جائے تو جو صورت بنتی ہے، اُسے عقل سلیم ماننے میں متامل ہی رہتی ہے۔ اس لئے جب ہم اس لفظ کا متذکرہ بالا فارمولے کے مطابق جائزہ لیتے ہوئے اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کا اصل اور صحیح مفہوم کیا ہو سکتا ہے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن حکیم میں یہ لفظ جاری کرنے، جاری رہنے دینے اور تسلسل حیات کے مفہوم سے جڑا ہوا ہے۔

اس بات کی تفصیل میں جائے بغیر کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کس طرح سے تسلسل حیات کو سنبھالے رکھتی ہے۔ اتنی بات کہنا ضروری ہو جاتا ہے کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کی حیات کے تسلسل کے شعبے کا انچارج بنا کر اُن کو اپنی نیابت کا فریضہ سرانجام دینے کی بابت مطلع فرما رہا ہے۔ اسی سبب سے حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد عالی مقام ہے کہ 'ان اللہ معطی و ان القاسم' یعنی اللہ مجھے عطا کرتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں۔ اللہ رب العالمین ہے اور حضور ﷺ رحمت اللعالمین یعنی کائنات کو تخلیق کرنے اور اس کی بقا کے وسائل کی فراہمی اللہ رب کریم نے اپنے ذمے لی ہوئی ہے اور ان وسائل کی تقسیم اور اس کائناتی نظام کے تسلسل کے شعبے کا انتظام حضور ﷺ کے سپرد کیا گیا ہے۔

Scanned by CamScanner

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنِ حکیم میں جو آیت ایک سو چودہ مرتبہ استعمال ہوئی ہو، اس کی معنویت اور اہمیت عام آیات کی نسبت یقیناً اسی قدر بڑھی ہوئی ہوگی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط کو سوائے سورہ توبہ کے، قرآن کی ہر سورت کی ابتدائی اور اولین آیت بنایا جانا اس کی معنویت کی ہمہ گیریت، پھیلاؤ اور وسعتوں کی ایک روشن اور واضح دلیل ہے۔ ہمارے یہاں عموماً اس کا جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے 'میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے'۔ اس ترجمہ میں 'میں شروع کرتا ہوں' کے الفاظ شاید اپنی نیت کے اظہار کے لئے اللہ اور اُس کے رسول کے اس حکم کے تحت شامل کر لئے گئے ہیں کہ ہم جب بھی کسی کام کا آغاز کریں تو بسم اللہ سے کریں ورنہ متن میں اس کی کوئی گنجائش نظر تو نہیں آتی۔ کیونکہ فارسی اور انگریزی کے تراجم میں ان الفاظ کا کوئی متبادل ترجمہ شامل نہیں کیا جاتا۔ وہاں تو سیدھے سادھے انداز میں

Scanned by CamScanner

'بہ اسم خدائے مہربان ورحیم' اور

In the Name of God, the Most Beneficient and the Most Merciful

ہی کیا جاتا ہے۔

اگر ہم سے دریافت کیا جائے کہ ہر کام کے آغاز کے لئے بسم اللہ یعنی تسمیہ ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ تو ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے کہ اس سے برکت ہوتی ہے یا یہ کہ یہ برکت کے لئے ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی اس سے آگے بڑھ کر سوچے کہ یہ برکت کیا ہوتی ہے تو اس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی ٹھوس بات نہیں ہوتی۔ ہم سہولت اور آسانی کو برکت کا حاصل مان کر اس سے مزید آگے یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ اگر برکت کا مفہوم سہولت اور آسانی ہی ہے تو وہ کیسے اور کیوں حاصل ہوتی ہے؟ تسمیہ کے الفاظ برکت کے لئے ہیں تو اس کا میکانزم اور طریقہ کیا ہوتا ہے؟ یہ سوچنے کی ہم نے نہ تو کبھی تکلیف کی ہے اور نہ ہی خود میں اس کا یارا پاتے ہیں۔ لگ بھگ ہزار سات سو سال سے ہم نے سوچنے، غور وفکر کرنے، تعقل اور تدبر کے کام شعبے مغربی اقوام کے حوالے کئے ہوئے ہیں۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ قرآن میں تفکر، تعقل، تدبر کرنے اور ادراک، فہم، سمجھ اور علم کو بڑھانے کے حوالے سے سات سو چھپن آیات ہیں لیکن ہم نے اُن سے منہ ہی نہیں موڑا بلکہ عملاً قطع تعلق بھی کیا ہوا ہے۔

قرآن فہمی میں حائل دشواریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے الحاج مولانا عبدالکریم پاریکھ "ناگپوری اپنی مرتبہ 'آسان لغات القرآن' میں رقمطراز ہیں۔

"کسی انڈیکس کی مدد سے یا اشاریہ میں آیتوں کے اگلے پچھلے حصے دیکھ کر اپنے سابقہ اور طے شدہ خیالات کی تائید میں جو لوگ قرآن کے بارے میں بات کرتے ہیں، انہیں اصل کلام اللہ کی چاشنی اور حلاوت سے محرومی ہے اور ایسے لوگ علم کی دنیا میں دیانتدار نہیں مانے جاسکتے اور دراصل قرآن کے بھیجنے والے اور لانے والے کی عظمت سے

Scanned by CamScanner

نہیں واقفیت ہی نہیں۔ اسی لئے بعض ایسے لوگوں نے انکار سنت یا انکار حدیث کا فتنہ بھی کھڑا کیا کہ عمل صالحہ اور نمونے سے چھٹی ملے۔ دماغی عیاشی کے لئے بحث ومباحثہ کے لئے تک بندی کرنے والے ان اصحاب کو بعض سادہ لوح مفکرین نے اہل قرآن جیسے عظمت والے خطاب سے نواز دیا حالانکہ ایسے افراد کو قرآن کی ہوا بھی نہیں لگی۔ پھر چونکہ یہ نام نہاد اہل قرآن حدیث کا استخاف اور انکار کر کے سنت کو بیچ سے ہٹا دینا چاہتے تھے اس لئے اہل حق صالح علمائے ربانی کا ایک بڑا گروہ حدیث کی مدافعت پر کھڑا ہوا۔ لیکن وہ بھی بحث و تکرار میں الجھ کر اعتدال سے آگے بڑھ گئے اور ان میں سے بعض محترم ہستیوں نے قرآن کے پڑھنے پڑھانے والوں کو بھی پست کر دیا کہ یہ ہر ایک کا کام نہیں۔ اس طرح شیطان کو دہرا مقصد حاصل ہو گیا کہ قرآن کی مدافعت کرنے والے بے عمل اور جاہل نکلے اور جو لوگ حدیث وسنت کی مدافعت کرنے والے تھے انہوں نے قرآن پڑھا، سمجھنا بہت مشکل اور دور کی بات بتانا شروع کیا اور اس راہ کے بے شمار خیالی خطرات کا تذکرہ ہونے لگا۔"

قرآن کا مطالعہ کرنے والے اس حقیقت سے بخوبی روشناس ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی بہتری اور بھلائی کی خاطر اس پر یہ بات لازم کر دی ہے کہ ہر قال اور ہر حال میں انسان کا ربط اور تعلق اُس کے خالق سے جڑا رہے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ انسان اپنے خالق اور مالک اللہ جل جلالہ سے رابطے میں رہے، انسان کو اللہ کی طرف متوجہ رہنا لازم آتا ہے۔ اسی توجہ الی اللہ کے حصول میں معاونت کے لئے حضور ﷺ نے ہمیں ایک ایسا نظام عطا فرمایا جس پر کاربند رہنے سے انسان کو توجہ اور دھیان اللہ کے طرف مبذول رکھنے میں سہولت اور آسانی رہتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر مسلمان تسبیہ، کلمہ طیبہ اور نمازیں بھی پڑھ رہا ہے، تلاوت کلام پاک کا بھی اہتمام کرتا ہے تو پھر اس رونا رونے کی بھلا کیا توجیہہ ہے کہ ہم مسلمان راندہ درگاہ اور معتوب ہیں۔ یا تو ہمارا رونا غلط ہے اور یا پھر (نعوذ باللہ) ہمیں

Scanned by CamScanner

عطا کیا گیا نظام اصلاح کا متقاضی ہے۔ اب اگر اصل بات کی کھوج کی جائے تو جو بات سامنے آتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ نہ تو ہمارا رونا غلط ہے اور نہ ہی اللہ کے عطا کردہ نظام میں کوئی کمی یا خامی ہے۔ اگر کوئی غلطی یا کمی اور خامی ہے تو ہمارے سمجھنے میں ہے۔ ہم بات کو نہ درست انداز سے جانتے ہیں اور نہ ہی اس کو صحیح زاویے سے سمجھتے ہیں اور نہ ہی اُس کو سمجھنے کا کوئی جتن کرتے ہیں اور پھر روتا اس بات کا روتے ہیں کہ ہمیں اس کے مطلوبہ ثمرات اور موعودہ فوائد حاصل نہیں ہو رہے ہیں۔

بسم اللہ شریف کا لغوی مطلب دیکھیں۔ اللہ کے نام پہ، جو بڑا مہربان اور نہایت رحیم ہے۔ اس بات کو قدرے وضاحت سے سمجھنا ضروری ہے کہ لغوی مطالب اور مفاہیم سے روگردانی ہمیں متن کے اصل مفہوم سے دور کرنے کا باعث اور سبب تو نہیں بن رہی۔ لغوی مطالب سے اصل مفہوم کو سمجھنے میں مدد لینا اور اصل مفہوم کو لغوی مطالب سے بلند ہو کر سمجھنا ایک بات ہے اور اپنی خواہشات اور سہل پسندی کے ہاتھوں اپنے انداز سے متن کے مفہوم کا تعین کرنا اور اُس کو دوسروں پر مسلط کرنا اصل مفہوم میں تحریف سے کم نہیں ہو سکتا۔

غیر جانبداری سے تسمیہ کا مفہوم سمجھنے کی خاطر ہم اس بات پہ غور کرتے ہیں کہ کسی کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنے اور کسی کام اللہ کی خاطر یا اللہ واسطے کرنے میں کیا فرق ہے۔

ایک صاحب کہتے ہیں، 'مجھے فلاں چیز اللہ نے دی ہے۔

دوسرے صاحب اسی چیز کی بابت فرماتے ہیں کہ یہ چیز مجھے اللہ نے دی ہے۔

جبکہ ایک تیسرے صاحب کا کہنا یوں ہے کہ اللہ نے مجھے یہ چیز دی ہے۔

اسی طرح ایک اور صاحب یوں گویا ہوتے ہیں، اللہ نے یہ چیز مجھے دی ہے۔

اب ان چاروں جملوں کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے جملے میں صاحب خود کو دوسرے میں چیز کو اور تیسرے اور چوتھے جملے میں اللہ کو اولیت دے رہے ہیں۔ یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جو بولنے میں بھی اللہ کو اولیت دیتے ہیں اور بندے اور اشیاء کو

Scanned by CamScanner

ثانوی مقام دیتے ہیں۔ بول چال سے آگے بڑھ کر جب اسی ترتیب کو افکار و نظریات، فکر و عمل میں تلاش کیا جائے کہ کتنے افراد اپنے افکار و خیالات میں پہلے اللہ کو سوچتے اور بعد میں اشیائے کائنات اور اپنے مابین رشتہ استوار کرتے ہیں۔ یہ طرزِ فکر ہمیں انبیا علیہم السلام اور اُن کے تربیت یافتہ افراد کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔

انبیا کو یہ طرزِ فکر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی جاتی رہی ہے تاکہ لوگ اپنے ذہن اور اپنی طرزِ فکر کو اُن کی مثال بنا سکیں۔ ہر نبی کی امت میں اُن کے اولین پیروکاروں نے اپنی طرزِ فکر کو کم و بیش اُن کے ذہن کے مطابق بنایا، یا اس کی کوشش کی، لیکن بعد میں آنے والے پیروکار اُس ذہن کو کماحقہٗ اپنانے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ بعد میں آنے والے پیروکاروں میں شغف کی آنچ مدھم پڑنے کے ساتھ ساتھ دنیادار مفاد پرست عناصر کی چالاکیاں اور عیاریاں ہی ہیں۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا نام اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ افراد میں سے ایک ہے۔ وہ اپنی کتاب 'لوح و قلم' میں رقمطراز ہیں۔

"انبیا اس حیثیت کو حاصل کرنے کا اہتمام اس طرح کیا کرتے تھے کہ وہ جب کسی چیز کے متعلق سوچتے تو اُس چیز کے اور اپنے درمیان، کوئی رشتہ براہ راست قائم نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ اُن کی طرزِ فکر یہ ہوتی تھی کہ کائنات کی تمام چیزوں کا اور ہمارا مالک اللہ ہے۔ کسی بھی چیز کا رشتہ ہم سے براہ راست نہیں ہے بلکہ ہم سے ہر چیز کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ رفتہ رفتہ اُن کی یہ طرزِ فکر مستحکم ہو جاتی تھی اور اُن کا ذہن ایسے رجحانات پیدا کر لیتا تھا کہ جب وہ کسی چیز کی طرف مخاطب ہوتے تھے تو اُس چیز کی طرف خیال جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف خیال جاتا تھا۔ اُنہیں کسی بھی چیز کی طرف توجہ دینے سے پیشتر یہ احساس عادتاً ہوتا تھا کہ یہ چیز ہم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتی، اس چیز کا اور ہمارا واسطہ محض اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہے۔"

Scanned by CamScanner

"جب اُن کی طرزِ فکر یہ ہوتی تھی تو اُن کے ذہن کی ہر حرکت میں اللہ تعالیٰ کا احساس ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی بحیثیت محسوس کے، اُن کا مخاطب اور مدِ نظر قرار پاتا تھا اور قانون کی رو سے اللہ تعالیٰ کی صفات ہی اُن کا احساس بنتی تھیں۔ رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ کی صفات اُن کے ذہن میں ایک مستقل مقام حاصل کر لیتی تھیں یا یوں کہنا چاہیے کہ اُن کا ذہن اللہ تعالیٰ کی صفات کا قائم مقام بن جاتا تھا۔ یہ مقام حاصل ہونے کے بعد اُن کے ذہن کی ہر حرکت اللہ تعالیٰ کی صفات کی حرکت ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ کی صفات کی کوئی حرکت قدرت اور حاکمیت کے وصف سے خالی نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ اُن کے ذہن کو یہ قدرت حاصل ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے ارادے کے مطابق موجودات کے کسی ذرہ، کسی فرد اور کسی ہستی کو حرکت میں لا سکتے تھے۔"

"بسم اللہ شریف کی باطنی تفسیر اس ہی بنیادی سبق پر مبنی ہے۔ اولیائے کرام میں اہلِ نظامت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی ذہن عطا کیا جاتا ہے اور قربِ نوافل والے اولیائے کرام اپنی ریاضت اور مجاہدوں کے ذریعے اس ہی ذہن کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں"

اس اقتباس میں جو بہت ہی توجہ طلب بات بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کو کسی بھی چیز کی طرف توجہ دینے سے پیشتر عادتاً یہ احساس ہوتا تھا کہ اس چیز سے اُن کا واسطہ اور رابطہ صرف اللہ کی وجہ اور معرفت سے ہے۔ براہ راست کسی بھی چیز سے اُن کو کوئی واسطہ اور ربط نہیں ہے۔ کسی بات کا عادتاً احساس ہونا تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب کوئی فرد خود سے گزر کر کسی چیز کو محسوس کرے اور اُس کو اتنی بار محسوس کرے کہ وہ احساس اُس کی عادت بن جائے۔ محض اس بات کو سن لینے یا پڑھ لینے سے یہ بات سمجھ میں آ بھی جائے تو اس سمجھ میں آ جانے والی بات کی لگاتار مشق اور اُس پہ پیہم عمل کے بغیر وہ احساس نہیں بن سکتی اور پھر کسی احساس کی عادت بنانے کے لئے جو جہدِ مسلسل درکار ہے، اس پہ آمادہ و تیار کرنے کے ساتھ ساتھ اس عمل میں آسانی اور سہولت پیدا کرنے کو ہمیں تسمیہ تعلیم کیا گیا تا کہ ہم کسی بھی

Scanned by CamScanner

کام کی طرف متوجہ ہوں تو ہمارے ذہن میں یہ بات موجود ہو کہ ہم اس کو اس لئے کر رہے کہ ہمیں اسم اللہ کی نسبت حاصل ہے۔

مرشد کریم حضور خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہ العالی، خانوادہ سلسلہ عظیمیہ اور ایک معروف روحانی سکالر ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ 'نمرود، فراعین مصر اور شداد وغیرہم ایسے لوگ تھے جو بذاتِ خود تو اللہ کو ہی خدا مانتے تھے لیکن لوگوں کے سامنے آ کر خود خدا بن بیٹھتے تھے۔ وہ خود تو اللہ سے ہی دعا مانگتے تھے لیکن دوسروں کو اپنے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتے تھے۔ اُن کو یہ بات بہت اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ مخلوق ہیں، خالق اور مالک تو اللہ کی ذات ہے۔ اللہ ہی پیدا کرتا ہے اور علم بھی اللہ ہی عطا کرتا ہے۔' قرآن اُن کا تذکرہ اسی وجہ سے عبرت انگیز انداز میں کرتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو دوسروں کو اللہ تعالیٰ کو اس طرح سے نہیں سمجھنے دیتے تھے، جیسا کہ اللہ کو سمجھنے کا حق ہے۔ وہ خود کو اللہ کی خدائی میں شریک ٹھہراتے اور خود کو اوتار بتاتے۔ خواہشِ اقتدار کے ہاتھوں مغلوب ہو کر وہ خود کو ہی خدا منوانے کے جتن کرتے لیکن تنہائی اور مشکل وقت میں اُسی کے سامنے گڑگڑاتے اور اسی کو پکارتے۔

اللہ اسم ذات ہے۔ رحمٰن اور رحیم اسمائے صفات میں سے ہیں۔ آدم کو اللہ نے علم الاسماء عطا کیا تا کہ وہ دیگر مخلوقات پہ شرف و امتیاز کا حامل ہو سکے۔ علمائے باطن کا بیان ہے کہ اللہ کی تمام صفات اُس کی ذات سے ہی منسلک اور مربوط ہیں۔ اللہ کا ہر اسم اس کی کسی نہ کسی صفت کا اظہار کرتا ہے۔ جب ہم اللہ کا کوئی اسم اپنی زبان سے ادا کرتے اور اُس اسم کا ورد کرتے ہیں تو اُس اسم سے مخصوص صفت کی تجلّی حرکت میں آ کر ورد کرنے والے کے ذہن میں دور کرتی اور اُس کی روح کو اپنی نورانیت سے سیراب کرتی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے سوا کسی اور نبی نے اللہ کو اسم ذات کے حوالے سے اس طرح نہیں پکارا جس طرح آپ ﷺ نے پکارا۔ قرآن حکیم میں انبیا سے منسوب تمام دعائیں لفظ رب، ربی یا ربنا سے آغاز ہوتی ہیں یعنی تمام انبیا نے میرے رب یا ہمارے رب کہہ کر اللہ کو مخاطب کیا

Scanned by CamScanner

جبکہ حضور ﷺ سے منقول تمام ادعیہ ماثورہ لفظ اللّٰھم سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی میرے یا ہمارے اللہ۔ اسم ذات کے حوالے سے پکارنے پر اللہ کی ذات کی تجلیات بندے کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور اسم صفت کے حوالے سے پکارنے پر اللہ کی صفات کی تجلیات بندے پر ورود کرتی ہیں۔ تسمیہ کا زبان سے ورد اسم ذات وصفات دونوں ہی قسم کی تجلیاں انسانی ذہن پہ نزول کرتی ہیں اور قلب سے اس کا ورد روح انسانی کو سیراب کرتا ہے۔

شعور اس بات کو جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، اصل بات یہی ہے کہ اللہ کی صفتِ ربوبیت ہی انسانی لاشعور اور اُس کی زندگی کو سنبھالے ہوئے ہے اور اسی وجہ سے شعوری طور پر غیر رب کی نفی اور اللہ کی ربوبیت کا اقرار لازم ہو جاتا ہے۔ قرآن بسم اللہ کے فوراً بعد الحمد للہ رب العالمین کہلوا کر ذہن انسانی میں انہی طرزوں کے مطابق سوچنے کی بنیاد رکھتا ہے۔ اب اگر ہم اس بات کا خود میں اتنا بھی شعور اجاگر نہ کریں کہ قرآن کی فراہم کردہ بنیاد پہ اپنے اذہان کی تعمیر کرنے میں کوشاں رہیں تو بنجر اور شور زدہ زمین میں کتنا بھی پانی انڈیلیں، اُس کو جیسا بھی پانی دیں، وہ سیراب نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہاں کوئی کھیتی اُگ سکتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے واقعے میں اللہ تعالیٰ ہمیں یہی سبق دیتے ہیں کہ جب انہوں نے ستارے، چاند اور سورج کو دیکھ کر اپنے اس گمان کو جھٹلا دیا کہ وہ اُن کا رب ہو سکتے ہیں تو غیر رب کی اس لگاتار شعوری نفی کے سبب ہی انہیں وہ مقام نصیب ہوا کہ رہتی دنیا تک انہیں ابوالانبیاء کے نام سے جانا گیا اور جانا جاتا رہے گا۔

Scanned by CamScanner

غور و فکر کے چند انداز

کسی بھی بات پہ جب غور کیا جاتا ہے تو ذہن انسانی اس پہ مختلف زاویوں اور انداز سے غور کر سکتا ہے۔ غور و فکر کے نتیجے میں ذہن کچھ نتائج اخذ کرتا ہے۔ غور و فکر کے ذیل میں کی جانے والی منطقی اور فلسفیانہ موشگافیوں اور اصطلاحات کا جائزہ رکھنے والے اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ سوچ بچار کے بنیادی طور پر دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں ایک طریقہ کسی چیز کی بابت شعوری انداز میں سوچنا اور غور و فکر کرنا اور دوسرا کسی معاملے پر لاشعوری تفکر سے مدد لینا۔ شعوری انداز میں غور و فکر کی استدلالی اور استخراجی طرزوں پر زیادہ اصرار کیا جاتا ہے۔ ہم یہاں منطق اور فلسفے کے قوائد و ضوابط میں الجھے اور وہاں استعمال ہونے والی اصطلاحات کو زیر بحث لائے بغیر غور و فکر کی ان مختلف طرزوں کو عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کریں گے جن کی مدد سے ہم قرآن حکیم کو زیادہ بہتر انداز میں سہولت اور آسانی سے سمجھ سکیں۔

قرآن حکیم پہ غور و فکر کا ایک انداز یہ ہو سکتا ہے کہ ابتدائی طور پر ہم الفاظ قرآنی کا درست مفہوم پانے کے لئے اُن پر غور کریں اور الفاظ پہ ایک ایک کر کے غور کریں۔ اپنے

Scanned by CamScanner

عربی ذخیرۂ الفاظ میں بتدریج اضافہ کریں۔ خصوصاً یہ دیکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ اُن الفاظ کو کن مفاہیم کی ادائیگی کے لئے اپنے کلام میں استعمال فرما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ الفاظ کو ہماری محدود لغت کے مطابق استعمال کرنے کا پابند نہیں ہے۔ وہ الفاظ کو ایسے مفاہیم ادا کرنے کے لئے بھی استعمال کرتا ہے جو اُس وقت مروج نہ ہوں بلکہ آئندہ کبھی کسی اور زمانے میں رائج ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن کو تمام وقتوں کے لئے کافی قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ قرآن حکیم کی اسی خاصیت کی وجہ سے چودہ سو سال پہلے کی عربی آج تک متروک ہونے سے محفوظ ہو چکی ہے۔

- اس کے ساتھ ساتھ یا اس سے اگلی منزل پہ ایک ایک آیتِ قرآنی پہ غور کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ شروع میں زیادہ مشہور اور آسان آیات پہ غور کرنا زیادہ بہتر ثابت ہوسکتا ہے۔
- اس کے علاوہ ہم قصص الانبیاء یعنی قرآنِ حکیم میں انبیاء علیہم السلام کے مذکور واقعات اور اُن سے منسوب معجزات میں مستور حکمتوں کی تلاش کے لئے اُن پر غور کریں۔ قرآنِ حکیم میں کسی نبی کی بابت حوالے متفرق سورتوں میں موجود ہیں۔ جب کسی ایک نبی کے واقعات پہ تفکر کیا جائے تو اُن تمام مقامات کو نظر میں رہنا چاہیے، جہاں جہاں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔
- ایک اور طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم اُن اُن باتوں پہ زیادہ غور کریں جن کی بابت غور و فکر کا حکم خود کلامِ پاک دے رہا ہے اور جہاں جہاں قرآن خود دعوتِ فکر دیتا ہے وہ مقامات جیسا کہ اکثر لوگوں کے علم میں ہے ساڑھے سات سو سے تجاوز کرتے ہیں۔ اُن میں قوانینِ فطرت اور اُن کے پس پردہ حکمت و مشیت الٰہی، انسانی رویوں اور رجحانات پہ اُن کے اثرات وغیرہ شامل ہیں۔ مثلاً یہ دن اور رات کیا ہیں، یہ بارش کیا ہے، اور وہ تمام باتیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں قرار دیتا ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں مــــا ادراک کہہ کر ہمیں دعوت ادراک و آگہی دے رہا ہے وہ مقامات بھی خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔

Scanned by CamScanner

- قرآن میں بیان کردہ اوامر و نواہی، قوانین معاشرت، شریعت، طریقت اور معرفت کا ماخذ اور بنیاد ہیں۔ ان پر غور و فکر کے نتیجے میں عملی زندگی کی راہیں درست ہو سکتی ہیں۔ زندگی کو قرآنی اوامر و نواہی کی روشنی میں گزارنے سے انسان نہ صرف پر سکون اور مفید انداز میں زندگی بسر کرتا ہے بلکہ حیات بعد الموت بھی اس کے لئے خوشگوار اور پر مسرت ہو جاتی ہے۔

- علمائے باطن کے مطابق قرآن حکیم کو جن تین عنوانات کے تحت سمجھا جاتا ہے وہ معاشرت، تاریخ اور معاد ہیں۔ انسان کی دنیاوی زندگی کے تمام شعبے معاشرت کے ذیل میں ہی آتے ہیں۔ قرآن میں مذکور ماضی کی تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کی داستان کو تاریخ کے زمرے میں رکھتے ہوئے اس کا مطالعہ کرنے سے انسان اس بات سے آگاہ ہو سکتا ہے کہ انسانی شعور کی ترقی اور ترویج میں کیا کیا منازل آتی ہیں اور انسان ان منازل کو پہلے بھی کبھی سر کر چکا ہے یا نہیں؟ جب کہ معاد انسان کی آئندہ زندگی کے مراحل اور کائنات کے اس سفر کی روداد کو کہا جاتا ہے جو حیات بعد الموت اور زندگی کے مابعد الطبعیاتی پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

- قرآن کو سمجھنے کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی نیابت کے جس شرف سے سرفراز کیا ہے اس کو انسان کیونکر اور کیسے نبھا سکتا ہے؟ یہ قرآن ہی ہے جو ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافت الٰہیہ کے جلیل القدر منصب پر فائز کرنے کے لئے تخلیق کیا اور اس کو تخلیقی فارمولوں کا علم، علم الاسماء کی صورت عطا کیا۔ اس منصب جلیلہ پر فائز ہونے سے پہلے انسان کو کچھ بنیادی علوم سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ وہ کون سے علوم ہیں جو اس منصب جلیلہ کے حصول کے لئے لازم ہیں اور وہ کون سی صلاحیتیں ہیں جو اُن علوم کے درست انداز میں استعمال کے لئے ضروری ہیں؟ ان سب باتوں کا سراغ قرآن ہی دیتا ہے۔ نیابت الٰہیہ کی بنیادی شرط عرفان الٰہی قرار پاتی ہے اور

Scanned by CamScanner

قرآن حکیم عرفان و آگہی کے اعلیٰ ترین مدارج طے کروانے کی سب سے زیادہ مستند دستاویز ہونے کے ناتے ہماری کس قدر توجہ چاہتا ہے اس کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

﴿ قرآن پہ غور و فکر کا ایک انداز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ذہن میں آنے والے سوال کو ایک کاغذ پہ لکھ کر سامنے رکھ لیں اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس بات کی بابت قرآن کیا کہتا ہے، اس کا با ترجمہ مطالعہ کرنا شروع کر دیں۔ یہ بات چونکہ خود کلام پاک اپنی بابت ہمیں بتاتا ہے کہ " کوئی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات ایسی نہیں ہے کہ جس کا تذکرہ اس کتاب میں نہیں کیا گیا"، اس لئے جب ہم اس زاویے سے قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو کسی نہ کسی آیت یا محض ایک لفظ سے ہی ہمیں اپنے سوال کا جواب مل جاتا ہے۔

﴿ یاد رہے کہ لاشعوری تفکر سے مدد لینے کے لئے ضروری ہے کہ شعور کو اس طرف متوجہ رکھا جائے کہ وہ خود کو لاشعور سے ہم آہنگ کرنے پہ آمادہ و تیار ہو۔ اس تیاری کے تقاضوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انسان اپنے شعور کی سکت اور پھیلاؤ کو بڑھانے کی جدوجہد کرتا رہے۔ جس انسان کا شعور جس قدر توانا اور طاقتور ہوگا، وہ لاشعور کی تحریکات کو اسی قدر بہتر انداز میں اپنے اندر سمیٹ اور سمجھ سکے گا ورنہ یوں تو تمام حقائق لاشعور جانتا ہی ہے۔ اصل کوشش اور کاوش یہی ہونی چاہیے کہ اطلاعات اور حقائق کو لاشعور سے بہتر اور مکمل انداز میں وصول کیا جا سکے۔

﴿ شعور انسانی اپنی تربیت، ترقی اور ترویج کے لئے وہبی اور الوہی راہنمائی کا محتاج ہے۔ وہبی راہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو ضمیر عطا کیا ہے۔ اسی ضمیر کو علمائے باطن نور باطن بھی کہتے ہیں۔ اس نور باطن کی روشنی میں قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے سے قرآن کے علوم کا درست ادراک ممکن ہو سکتا ہے۔ الوہی راہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی اور الہام کو پسند فرمایا۔ انبیاء کرام کو وحی کے ذریعے راہنمائی کے بنیادی نکات تعلیم کئے جاتے تھے اور اُن کے تربیت یافتہ اور اُن کے علوم کے وارث اولیاء کرام کے لئے الہامی طرزوں میں سے

Scanned by CamScanner

ایک یا ایک سے زیادہ طرزوں کا انتخاب کرنا اللہ تعالیٰ کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔ اس بات کو حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے کچھ یوں بیان کیا تھا کہ قرآن کی اصل فہم تو اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جس کو اللہ خود پڑھا دے، ورنہ اس کلام الٰہی کو سمجھنے کا کس کو یارا ہو سکتا ہے۔

اب اس جملے کو سن کر اگر ہم ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں اور یہ سمجھ لیں کہ جب اللہ پڑھائے گا تو ہم پڑھ لیں گے ورنہ ہمارے پڑھنے کا کیا فائدہ کہ اگر اس کی سمجھ آ ہی نہیں سکتی، تو یہ کچھ زیادہ درست وطیرہ نہیں ہوگا۔ اس جملے میں اصل بات یہ تعلیم کی گئی ہے کہ جیسے یونیورسٹی کے کسی پروفیسر سے پڑھنے اور اکتساب علم سے پیشتر انسان کو پرائمری، مڈل، میٹرک اور کالج کی سطح پر حصول علم لازم آتا ہے اسی طرح اللہ سے براہ راست اکتساب فیض کے لئے خود کو تیار کرنے کے بہت سے مراحل طے کرنے ضروری ہوتے ہیں۔

اسی بات پر استنباط کر کے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان ایک بندے کی بات کو سمجھنے میں اگر اتنی بڑی ٹھوکر کھا سکتا ہے تو وہ خالق کی بات کو سمجھنے کا کس قدر اہل ہوگا؟ اسی لئے تو قرآن ھدی للمتقین کہہ کر خود اپنی تفہیم اور ہدایت پانے کے لئے تقویٰ یعنی سمجھنے میں احتیاط کی شرط عائد کرتا ہے۔

﴿ قرآن حکیم لاشعور سے رہنمائی کا جو طریقہ تعلیم کرتا ہے وہ سورہ الانشراح کی آخری دو آیات کے الفاظ میں کچھ یوں ہے۔ فاذا فرغت فانصب والیٰ ربک فارغب یعنی جب تک انسان فراغت اور رغبت کے ساتھ اپنے رب کی طرف یک سوئی سے گڑ کر نہ رہ جائے اُس میں نصب ہو کر نہ رہے تو ذہن لاشعور سے آنے والی اطلاعات کو سمیٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ علمائے باطن کے نزدیک مراقبہ کرنا اس حکم کی تعمیل ہی کی ایک صورت ہے۔ مراقبہ کرنا دراصل یک سوئی کے ساتھ اپنے لاشعور سے رابطے کی کوشش کا نام ہے۔ قرآن پاک پہ شعوری سطح پہ جتنا بھی غور کیا جائے وہ کم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر لاشعور سے راہنمائی حاصل کرنے کو کسی آیت یا لفظِ قرآنی پہ غور کرتے کرتے آنکھیں بند

Scanned by CamScanner

کر کے، ذہن کو ڈھیلا چھوڑ دیا جائے۔ ذہن میں آنے والے خیالات سے گریز بھی نہ کیا جائے اور اُن پہ توجہ بھی نہ دی جائے تو ذہن بے خیالی کی ایسی کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے جب وہ اپنی محدودیت سے ابھر کر لاشعور سے آنے والی اطلاعات کی وصولی کا اہل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بات کا حقیقی مفہوم القاء ہونا، ایک نعمتِ خداوندی ہی ہوتا ہے۔ جب ذہن یک سو ہو کر کسی ایک نکتے میں گڑ جاتا ہے تو اس نکتے کا باطن کھلتا چلا جاتا ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاؒ بتاتے ہیں کہ قرآن پاک میں تین علوم کا تذکرہ ملتا ہے۔

۱۔ علمِ حضوری

۲۔ علمِ حصولی

۳۔ علمِ لدنی

علمِ حضوری وہ علم ہے جو اللہ کا علم ہے اور اللہ اپنے علم میں سے جس کو چاہے، جس قدر اور جیسے چاہے نواز سکتا ہے۔ اس علم کے تمام اجزاء حقیقتِ مطلقہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ علم حصولی تمام طبعی علوم کا مجموعہ ہے۔ اس علم کے خدوخال زیادہ تر قیاسات اور مفروضات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ علمِ لدنی علمِ حضوری اور علمِ حصولی کی حدیں قائم کرتا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف بھی کراتا ہے۔ یہ علم اُن حقائق پر مبنی ہے جو علمِ حصولی کی گہرائیوں میں تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ اس علم کے خدوخال آیاتِ الٰہی سے بنتے ہیں آیاتِ الٰہی سے مراد وہ نشانیاں ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے بار بار قرآن پاک میں توجہ دلائی ہے۔ جب یہ علم انبیاء کو حاصل ہوتا ہے تو علمِ نبوت کہلاتا ہے اور جب یہی علم اولیا اللہ کو حاصل ہوتا ہے تو علمِ لدنی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی قرآن پاک پہ غور و فکر کا ایک انداز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان اس کی راہنمائی میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پہ اس طرح سے تفکر کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو علمِ لدنی سے نواز دے۔

Scanned by CamScanner

علم لدنی کو حاصل کرنے کی سب سے اولین شرط یہی ہے کہ انسان اپنے باطن سے واقف اور روشناس ہو۔ اس کے ذہن میں اتنی سکت ہو کہ وہ اس علم کے انوار کو سہہ سکے، اس کے قلب و نظر میں اتنی صفائی ہو کہ وہ اوہام اور تعصبات سے نہ دھندلائیں اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے شعور کو اپنے اردگرد کے ماحول میں پیوست ہونے سے روک سکے۔ جب انسان کا شعور ماحول کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے تو اس میں اتنی لطافت پیدا ہو جاتی ہے کہ اوپر اٹھ کر لاشعور سے متصل ہو جاتا ہے۔ اپنے لاشعور سے اتصال کے بعد بتوفیق ربانی بوسیلہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، رفتہ رفتہ اس علم کے نقوش روح سے ذہن میں منتقل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

یا ایُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْ

قرآن حکیم کی بعض آیات کا حرف ندا 'یا' سے آغاز کیا جاتا اُن کو نہایت معنی خیز بنا دیتا ہے۔ایک طرف یہ اجتماعی تخاطب کا انداز بن جاتا ہے اور دوسری طرف وہ اس گروہ کے لئے مخصوص ہو جاتی ہیں، جس گروہ کو مخاطب کیا جا رہا ہو۔ جیسے یـا ایھـا الـنـاس، یـا ایھاالذین امنو، یا ایھا الکافرون وغیرہ۔

قرآن حکیم میں لفظ امـنـو 258 مرتبہ آیا ہے اُن میں سے 85 مرتبہ اسکو یـا ایھـا الـذین امنو کی صورت استعمال کیا گیا ہے۔قرآن حکیم میں اگر کوئی لفظ ایک مرتبہ بھی استعمال کیا گیا ہو تو اس کی معنویت مقدار سے حوالے سے کم نہیں ہو جاتی لیکن جن الفاظ کو بار بار برتا جا رہا ہو اُن کی معنویت میں اصرار کی شدت کو ظاہر کرنے کے لئے ہم اس بات کو دیکھتے ہیں کہ کوئی لفظ کتنی بار وارد ہوا ہے جیسے اسم 'اللہ' 980 مرتبہ استعمال کیا جانا اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اسم اللہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

امنو کا لغوی مطلب 'بات کو ماننا' ہے۔ اصطلاحاً اس سے 'صاحب ایمان' ہونا مراد

Scanned by CamScanner

لیا جاتا ہے۔ اب صاحب ایمان ہونے کی بابت ہمارے تصورات کچھ اس قدر ارفع اور اعلیٰ ہیں کہ عام آدمی صاحب ایمان ہونے کی دُعا ہی کرتا مر جاتا ہے۔ ہم یہ دُعا تو کرتے ہیں "اے اللہ تو ہمارا خاتمہ حالت ایمان پر کر"۔ لیکن کبھی یہ زحمت گوارا نہیں کرتے کہ لغوی اور اصطلاحی معنوں کی تہہ میں اتر کر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ایمان کیا ہے اور حالتِ ایمان جس کے قیام کی ہم دُعا ہی کرتے رہ جاتے ہیں، وہ کیا ہے اور اُس کو کیسے اور کیوں کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اگر ہم اس لفظ کے لغوی معنوں سے اپنے غور و فکر کا آغاز کریں تو یا ایھاالذین امنو کا مفہوم کچھ یہ بنتا ہے کہ اے وہ لوگو! جو بات مانتے ہو۔ بات ماننا، بات کو سن کر، سمجھنے کے بعد، اس کو اپنے قلب و ذہن میں اتار لینے سے مشروط ہے۔ جب کوئی بات سن کر سمجھ لی جائے۔ اس کو سمجھ لینے کے بعد اس کو اپنے دل و دماغ میں اس طرح اتار لیا جائے کہ ذہن میں آنے والے خیالات آئندہ اُسی سانچے میں ڈھلتے رہیں تو اس حالت کو ایمان رکھنا کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی بات پہ ایمان لانے کے بعد انسان کے فکر و خیال میں یہ تبدیلی آجاتی ہے کہ وہ ہر بات کو اسی ترازو پہ تولتا ہے، اسی کسوٹی پہ پرکھتا ہے اور اسی فریم آف مائنڈ سے سوچتا ہے جو بات کو ماننے کے بعد بنتا ہے۔ اگر کوئی بات اس میزان پہ پوری نہیں اترتی تو وہ اُس کو یکسر رد کر دیتا ہے۔ اور اگر وہ اس کو یکسر رد نہ کر سکتا ہو تو کم از کم اس سے پہلو تہی تو ضرور اختیار کر لیتا ہے۔ اب اگر اس بات کا مقابلہ ہم 'ایمان' کے اُس مفہوم سے کریں جو ہمارے ذہنوں میں موجود ہے اور غیر جانبداری سے جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہمیں صاحب ایمان ہونے کے لئے کس قدر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

یہاں اس بات کو نہایت توجہ سے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اللہ رب کریم جب انسانوں میں سے ایک گروہ کو یا ایھاالذین امنو کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو بات کو سن کر، اپنے ذہنوں میں تول کر، اس کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد، اپنے

Scanned by CamScanner

دل و دماغ پہ حاوی اور طاری کر لینے کی صفت سے متصف ہوتے ہیں۔ اگر کوئی انسان خود میں اس صفت کو موجود اور فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بالکل بھی مخاطب نہیں ہے۔ اللہ کی باتیں اُس کے لئے ہرگز بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتیں۔ اللہ تعالیٰ اتنے بڑے ہیں کہ اگر کوئی انسان اللہ کی بات کو سمجھنے اور اُس پہ عمل پیرا ہونے پر آمادہ و تیار نہیں ہے تو اللہ کو اس بات سے نہ کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ ہی پڑ سکتا ہے۔ یہ تو صرف انسان کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بات کو سمجھے۔ اس کو اپنے قلب و نظر پہ طاری کرے یا نہ کرے یہ خود اُس کا اپنا انتخاب اور مطمع نظر ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ خود کو بری الذمہ قرار دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ماننے یا رد کرنے کا اختیار دے کر اس کو مکلف کر دیا ہے۔ وہ اُس کی بات کو سمجھنے کے بعد مانے، اُس پہ عمل پیرا ہو یا نہ ہو، اس کے اچھے یا برے جو بھی نتائج برآمد ہوں گے تو وہ خود ہی اُن کا سامنے کرنے کا پابند ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قادرِ مطلق نے جنت اور جہنم جیسے دو مختلف نتائج کو انسان کے لئے مقدور فرما دیا ہے۔

قرآن حکیم کی اصطلاح مومن کا مفہوم بھی یہی بنتا ہے کہ وہ لوگ جو بات مانتے ہیں اللہ اُن کو مومن قرار دیتا ہے۔ اس بات کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ مومن امن سے مشتق ہے یعنی بات ماننے والے بندے کو امن نصیب ہو جاتا ہے اسی لئے اُس کو مومن قرار دیا گیا ہے۔ مومن کا معروف ترجمہ صاحب ایمان یا ایمان رکھنے والا کیا جاتا ہے۔ اِس حوالے سے بھی دیکھا جائے تو یہی بات سامنے آئے گی کہ مومن ایسا فریم آف مائنڈ رکھنے والے انسان کو کہا جاتا ہے جو بات کو سمجھنے میں احتیاط کرتا ہے اور جب بات سمجھ لیتا ہے تو وہ اس کو اپنے اندر اس طرح سے اتار لیتا ہے کہ اس کا ذہن اور پوری شخصیت اس مانی ہوئی بات کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

سورہ فاتحہ قرآن حکیم کی وہ ابتدائی سورت ہے جس کا نماز کی ہر رکعت میں تلاوت کیا جانا فرض قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح ہر نمازی دن بھر میں چالیس تا اڑتالیس مرتبہ اس

Scanned by CamScanner

سورت کی تلاوت کا پابند قرار پاتا ہے۔ ہر روز اتنی بار اس سورت کی دہرائی اس کی اس خاص اہمیت ہی کے سبب ہے جو اس سورت کے الفاظ و مفاہیم اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ اس سورت کا ایک ایک لفظ اپنے اندر اک جہانِ معنی لئے ہوئے ہے۔ ہم محض نیکیاں کمانے اور ثواب اکٹھا کرنے کے لئے اس کی تلاوت کرتے ہی ہیں۔ اگر کہیں ہم اس کے الفاظ کے اُن مفاہیم کو پانے کی جدوجہد بھی کریں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ معتبر اور قابل قبول ہیں تو ہمارا اجر و ثواب کئی گنا بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اس کے عملی فوائد اور ثمرات بھی حاصل ہو سکیں گے۔

اس سورت کی بار بار دہرائی کے پس پردہ جو حکمت نظر آتی ہے وہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے اھدنا الصراط المستقیم کی دعا کرواتا ہے۔ اگر اس بات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو سوچنے والوں کو یہ بات بہت ہی عجیب لگتی ہے کہ ایک آدمی عمر بھر کی تمام نمازوں میں، اس دعا کو جتنی بار دہراتا ہے اس کی مقدار ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اب ایک آدمی باوضو ہو کر ہزاروں نہیں لاکھوں مرتبہ ایک دعا کرتا ہے اور پھر بھی یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کو صراط مستقیم نصیب ہو گیا ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس پہ تہمت سی محسوس ہوتی ہے کہ لاکھوں بار کی گئی دعا بھی اُس کے یہاں شرف باریابی اور قبولیت سے محروم رہی۔ اس پہ سوچا جائے کہ ایسا کیوں ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم دن جانے دن بوجھے ایک چیز کے طلبگار ہیں۔ ہمیں صراط مستقیم کی اگر سچ مچ کوئی طلب ہے بھی تو یہ امر ہمارے ذہنوں میں بالکل بھی واضح نہیں کہ صراط مستقیم اصل میں ہے کیا؟

ہماری جہالت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو گی کہ ہم ایک لفظ کو لاکھوں بار دہراتے تو ہیں لیکن زندگی میں اس پر ایک مرتبہ بھی اس حوالے سے کبھی غور نہیں کرتے کہ اس کا اصل مفہوم کیا ہے۔ ہماری تن آسانی کا یہ عالم ہے کہ ہم اپنی بہتری کے لئے بھی اپنے ذہن کو

Scanned by CamScanner

استعمال کرنے سے کتراتے ہی رہتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس سب کے باوجود بھی ہماری توقعات اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ ہم خود کو جنت اور مانگیۂ کا اجارہ دار بنائے ہوئے ہیں۔ پل صراط کی اصطلاح اور اُس سے منسوب تصورات نے بات کو الجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بال سے باریک، تلوار کی دھار سے تیز، جہنم پر معلق ایک ایسا پل جس سے گزرنے والا گنہگار کٹ کٹ کر جہنم کا ایندھن بن رہا ہو۔ اب اگر ایسی خوفناک حالت کا کوئی رشتہ صراط مستقیم سے جڑتا ہوگا تو انسان کے اندر اُس کی طلب اور اشتہا کیوں پیدا ہوگی؟ اب وہ کہنے کو کہہ تو رہا ہے اھدنا الصراط المستقیم لیکن اس کے اندر اس کی کوئی حقیقی طلب اور چاہت موجود نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کا عدل اس کے صراط مستقیم تک رسائی کے حق کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

ان الفاظ پہ بہت دھیان سے غور کر کے ان کے حقیقی مفہوم تک رسائی کی کوشش کی جانی چاہیے۔ عربی میں 'صرط' گلے کی اُس نالی کو کہا جاتا ہے، جہاں سے غذا گزر کر جسم میں داخل ہوتی ہے۔ اس سے لفظ صراط، گزرگاہ، راہ اور راستے کے مفہوم کے لئے بنا۔ مستقیم کا مفہوم اردو میں سیدھا لیا جاتا رہا ہے لیکن عربی میں اس لفظ کا مادہ قیم ہونے کے سبب یہ قیام، مقیم، قیوم اور قائم رہنے والی چیز ہی ہو سکتا ہے۔ لفظ سیدھا راستہ اُس قدر واضح مفہوم کا حامل نہیں جس قدر بات کو سمجھنے کے لئے مستقیم کا لفظ متقاضی ہے۔ ابہام یعنی مبہم مفہوم پہ اکتفا کرنے کی بجائے ہمیں بات کے اُس مفہوم تک رسائی کی کوشش کرنا لازم آتا ہے جو کہ حقیقی اور واضح ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اھدنا الصراط المستقیم کہہ کر ہم اللہ سے ایسی ہدایت کے طلبگار ہوتے ہیں جو حیّ و قیوم ذات کی سمجھ کو ہمارے اندر ایسے اتار دے کہ ہم اُس پر قائم ہو جائیں۔ ایاک نعبد کے بعد بھی مفہوم زیادہ چھپا ہے۔ کیونکہ ہم حالت نماز میں ہیں، اس کی عبادت تو کر ہی رہے ہیں تو اس کے بعد اور کون سی سیدھی راہ کے طلبگار ہیں؟

اس بات کو اس سورت کے اگلے الفاظ صراط اللذین انعمت علیھم کی روشنی

Scanned by CamScanner

میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ راہ اُن لوگوں کی جن پر انعام کیا گیا، کا ترجمہ بھی گہری توجہ چاہتا ہے۔ یہاں انعام کا لفظ نعمتوں کی بجائے 'نعم' یعنی قبول کئے جانے کے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔ 'انعمت' کو اگر انعام یعنی پرائز (Prize) کے مفہوم پر صاد کیا جائے تو بھی وہ اللہ کی بارگاہ میں شرف قبولیت سے مشروط ہی رہتا ہے۔ اس سے بھی یہ بات تصدیق ہو جاتی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی ایسی سمجھ کی طرف راہنمائی کے خواستگار ہیں جس کو بارگاہ رب العالمین کی طرف سے سندِ قبولیت سے نوازا گیا نہ کہ کوئی ایسی سمجھ جو اللہ تعالیٰ کو ناگوار خاطر ہو اور اس کو اللہ تعالیٰ ناپسندیدگی سے رد کر دے۔

سورہ فاتحہ کو اسی لئے فاتحہ اور ام الکتاب کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کے آغاز میں ہی انسان اس بات کو جان لے کہ وہ اللہ رب العالمین، جو رحمٰن اور رحیم ہے کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہو کر اس کی بابت اپنی سمجھ اور فہم کو ایسا بڑھانا چاہتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ خود چاہتا ہے نہ کہ ایسی سمجھ جو انسان چاہتا ہے۔

اصطلاحاً 'حمد' اللہ کی ذات وصفات کی تعریف اور سراہنے کو کہتے ہیں لیکن کیا انسان اللہ کی ذات وصفات کا اتنا ادراک رکھتا ہے کہ وہ اللہ کو اس حوالے سے جانچ کر اُس کو سراہ سکے تو یہ بات اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتی۔ کیونکہ اللہ خود ہی اپنی صفات کو بہتر جانتا ہے۔ انسان کی محدود عقل اور محدود تر شعور اس ذات بسیط کی لامحدود صفات سے اپنی محدودیت کی حدوں تک ہی آگاہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے الحمدللہ کا مفہوم 'تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں' کہہ کر ہم اپنے ذہن کو ہر ہر حوالے اور ہر طرح سے خود کو اللہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ 'الحمدللہ' کہلوا کر ہمیں اپنی مرکزی حیثیت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جب انسان اللہ کی مرکزیت پہ اپنی توجہ مرتکز اور مرکوز کرنے کا گر جان لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو اپنے قریب لے آتا ہے۔ اس قربت الٰہی کو ہی انعام کہا جائے تو بات کی معنویت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

اسی ضمن میں عمل صالح کی معروف اصطلاح کو جانچنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں

Scanned by CamScanner

بھی ہماری عقل ٹھوکریں کھائے ہوئے ہے۔ ہمارے ذہنوں میں اعمالِ صالح کا جو تصور مذہبی دانشوروں نے بٹھا دیا ہے، وہ اس قدر پیچیدہ اور مبہم ہے کہ کوئی انسان یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہے کہ اس کا کون سا عمل واقعی صالح ہے اور کون سا عمل اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ ہمارے یہاں یہ اصطلاح زیادہ تر نیک اعمال اور نیکی کے کاموں کے لئے رائج ہو کر رہ گئی ہے جبکہ قرآن کے نزدیک انسان جب کسی بات کو سمجھ کر مان لیتا ہے تو اس پر اچھی طرح سے عمل کرنا اس عمل کو صالح بنا دیتا ہے۔ صالح کا مفہوم محض اچھی طرح عمل کرنے سے بھی کسی قدر بڑھا ہوا ہے۔ اللہ کے نزدیک جب کوئی کام انعام کے لالچ، جزا کے حصول، اجر و ثواب کے لئے کیا جاتا ہے تو وہ انعام، اجر و ثواب اور جزا کا حقدار تو ہو سکتا ہے لیکن خوشنودی الٰہی کا نہیں۔ اور جب کوئی کام محض رضائے الٰہی اور اللہ کی خوشنودی کے لئے پوری دلجمعی، احتیاط اور مکمل طور پر ڈوب کر کیا جاتا ہے تو وہ کام عمل صالح کے ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اگر سورہ العصر کی تلاوت کے دوران اس مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو خسارے سے بچنے کے جو گُر تعلیم کرتا ہے وہ یہی ہیں کہ انسان بات کو اچھی طرح سمجھے، اُس کو مانے اور اُس پہ محض خوشنودی الٰہی کے لئے حقیقت پسندی اور استقامت سے عمل پیرا ہو۔ جب تک ہم فرامینِ الٰہیہ پر اُن کی اصل روح کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوں گے، ہم خود کو خسرانِ دنیا اور آخرت سے نہیں بچا سکیں گے۔ اسی بات پہ اللہ تعالیٰ زمانے کی گواہی دیتا ہے کہ یہ قوانین امر ہیں اور ہر زمانے کے لئے ہیں۔

Scanned by CamScanner

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

قرآن حکیم انسانی ذہن کی سکت اور رسائی کے مطابق نہایت مختصر لیکن بلیغ جملوں میں اُس کو ایسی باتوں کی تعلیم دیتا ہے کہ اس کے ذہن، عقل و شعور کی تربیت بھی ہو اور وہ بڑھتے اور پھیلتے بھی رہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے جملوں کی معنی آفرینی تبھی سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان ذوق اور شغف سے ان پر اپنی توجہ صرف کرے۔ ایسے بہت سے جملوں میں سے ایک جملہ لِمَ تقولون ما لا تفعلون یعنی مت کہو وہ جس پہ تم عمل نہیں کرتے۔ اس میں کسی بھی طرح کی کوئی ایسی بات نہیں جو سمجھنے میں دشوار ہو۔ سیدھے اور صاف الفاظ میں اس بات کو بتایا گیا ہے کہ انسان جس بات پہ عمل پیرا نہ ہو اُس کو وہ بات نہیں کہنی چاہیے۔ اس بات کو سمجھ لینے کے بعد اس پہ عمل نہ کرنا ہماری تیرہ بختی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اس بات پہ جتنا بھی غور و فکر کیا جائے اس حکم الٰہی کو ماننے اور اس پہ عمل پیرا ہونے میں انسان کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ان بہت سے فوائد و ثمرات میں سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہے کہ اس سے انسان کے اندر خود اعتمادی بڑھتی ہے۔ اُس کو اپنے کہے کا پاس

Scanned by CamScanner

رکھنا آتا ہے۔ اس سے اس کی قوتِ عمل بڑھتی ہے۔ انسان وہی کچھ کہتا ہے جس پہ وہ عامل ہو اور وہی کچھ کرتا ہے جو وہ کہتا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں سے ممتاز اور منفرد ہو جاتے ہیں ۔ایسے افراد کی Good will یعنی شہرت ایک ایسے انسان کی ہو جاتی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے قابل اعتماد ہوتے ہیں اُن پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

اب کون ہے جو یہ نہیں چاہتا کہ لوگ اُس پر بھروسہ نہ کریں، اس کو قابل اعتماد نہ سمجھیں۔ ہم سب یہی چاہتے ہیں کہ ہم جو کچھ ایک دفعہ کہہ دیں دوسرے اُس بات کو مان لیں۔ ہم اپنے ذہن میں بہت کچھ سوچتے ہیں۔ بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن ان باتوں پہ عمل نہیں کر پاتے۔ اس کو نفسیات کے حوالے سے ایک مسئلہ اور بیماری گردانا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی اسی نفسیاتی کمزوری کو دور کرنے کا ایک حل اُس کو تعلیم فرماتا ہے۔ کہ انسان اس بات پہ کاربند ہو جائے کہ اتنا ہی کہے جتنا وہ کرتا ہے یا کر سکتا ہے۔ اس سے انسان جھوٹ اور غلط بیانی سے بھی بچ جاتا ہے اور جھوٹ بولنے سے انسان کے اندر جو کمزوری آ سکتی ہے، وہ اس سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ جی ہاں۔ جھوٹ بولنے سے انسان کے افکار و اعمال پہ یہی اثر پڑتا ہے کہ اُس کے اندر سے سچائی کی طاقت کم پڑ جاتی ہے۔ وہ دوسروں کا اُس طرح سے سامنا کر ہی نہیں سکتا جس طرح سے ایک سچا اور کھرا انسان کرتا ہے۔ یاد رکھیں کہ حضور ﷺ کو صادق اور امین کا خطاب مسلمانوں نے نہیں دیا تھا۔ کفار اور مشرکین مکہ آپ ﷺ کی سچائی اور امانت داری کے اتنے قائل اور گرویدہ تھے کہ آپ کو صادق اور امین کہتے ہی نہ تھے مانتے بھی تھے۔ حضور ﷺ اپنی صداقت اور امانت داری پر قائم رہتے ہوئے جب غارِ حرا میں اترے تو اُن کو اپنی تمام تر توانائیاں تلاشِ حق میں صرف کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔

یہ بات ہم سب کے علم میں ہے کہ آج مسلمانوں میں جھوٹ، دروغ گوئی اور غلط بیانی اس قدر رواج پا چکے ہیں کہ ہم نے اس کو ایک چلن اور طرزِ معاشرت سمجھ کر اپنا لیا

Scanned by CamScanner

ہے۔اسی وجہ سے ہم میں اتنی ہمت اور سکت بھی نہیں رہی کہ ہم دیگر اقوام سے مقابلے اور اُن سے بہتر ہونے کی کوئی کوشش ہی کر سکیں۔آج ہم مغربی اقوام کے افراد کی حق گوئی کے قائل ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ سب باتیں ہم سے ہی سیکھی ہیں لیکن ہم خود ان پر عمل کرنے سے اور ان کے ثمرات سے مستفیض ہونے سے کیوں محروم ہیں؟ ہم میں کسی بات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے درکار قوت عمل ہی نہیں ہے تو اُس پر ہم عمل کر کیسے سکتے ہیں ؟یہی وجہ ہے کہ آج ہم سب یہ تو کہہ رہے ہیں کہ ہمیں یہ کرنا چاہیے اور وہ کرنا چاہیے۔لیکن ہم میں سے کتنے لوگ ایسے ہیں جو خود اپنی کہی ہوئی بات پہ خود عمل کرنے پہ آمادہ و تیار ہیں۔جب تک ہم سب اپنی اپنی جگہ، انفرادی طور ان باتوں پہ عمل پیرا نہیں ہوں گے جن کو ہم اچھا سمجھتے، مانتے اور کہتے ہیں، اس وقت تک اجتماعی کردار میں کوئی بہتری نہیں آسکتی۔

اسی بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ امت ہو یا ملت وقوم وہ افراد کا مجموعہ ہوتی ہے۔جس قوم یا ملت کے جیسے افراد ہوتے ہیں، ویسی ہی وہ قوم ہوتی ہے۔اسی لئے انبیاء کا عطا کردہ پروگرام ایک ایک فرد کی اصلاح کرنے پر اصرار کرتا ہے۔اس مقام پر ایک اور ضروری بات یہ بھی سمجھ لینے کی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے فرد کی اصلاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ ہر انسان فقط اپنی ہی اصلاح پر قادر ہے۔جب تک کوئی انسان خود اپنی اصلاح کرنے یا کروانے پر آمادہ نہیں ہوتا اس وقت تک کوئی اُس کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ قرآن اس بات لا اکراہ فی الدین کہہ کر واضح کرتا ہے۔یعنی اللہ کے دین میں کوئی زبردستی نہیں۔

دین ایک قرآنی اصطلاح کے طور پر مذہب اور ایک مذہبی نظام کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔قرآن اس کو اللہ کے بنائے ہوئے نظام اور سسٹم کے لئے برتتا ہے۔ یوم الدین کا ترجمہ کرتے وقت اس کو یوم جزاء یا روزِ آخرت کیا جاتا ہے۔دین کا دن نہیں۔ اس مفہوم میں اس کے معنی اتنے محدود ہو جاتے ہیں کہ انسان چاہتے ہوئے بھی اس میں

Scanned by CamScanner

دلچسپی نہیں لے پاتا۔اس بات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کہ مالک یوم الدین کا اصل مفہوم کیا ہے؟ ہمیں قرآن کی اصطلاحات یوم، نہار اور لیل وغیرہ کو ان کے معروف اور عام معنوں سے اوپر اٹھ کر سمجھنا ہوگا۔

یوم کا لفظ کلام پاک میں 349 مرتبہ استعمال ہوتا ہے اس کی دیگر صورتوں ایام، یوماً، یومکم، یومھم، یومین، اور یومئذ کی تعداد، اس کے علاوہ ہے اور وہ 133 بنتی ہے۔ان سب جگہوں پہ غور کیا جائے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ یوم کا یہی مطلب مراد لیا ہے جس مفہوم سے ہم عام طور پر واقف اور روشناس ہیں یا اس کا مطلب کچھ اور ہے؟ ہمارے آپ کے نزدیک یوم محض وقت کی ایک اکائی ہے جو چوبیس گھنٹوں پہ محیط ہے۔یا یہ کہ یہ کوئی مخصوص دن ہے۔لیکن اللہ تعالیٰ ہمارے اس مفہوم سے متفق ہوتا تو یہ کیوں فرماتا کہ و ما ادراک ما یوم الدین، و ما ادراک ما یوم الفصل۔

باطنی علوم سے روشناس افراد بتاتے ہیں کہ جس چیز کو انسان اپنے حواس کی مدد سے جانتا ہے اس کو اللہ یوم کہتا ہے۔اس بات کے پیش نظر مالک یوم الدین کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ اللہ اپنے بنائے ہوئے سسٹم کے اس حصے کا بھی مالک ہے جو حواس کی زد میں آسکتا ہے۔اسی طرح نہار جسے ہم دن کا وقت یا طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب سمجھتے ہیں ،حواس کی وہ رفتار ہے جو انسان پہ دن کے وقت طاری ہوتی ہے اور انسان اسی رفتار سے ان سے کام لیتا ہے۔حواس کی وہ رفتار جو غروب آفتاب کے بعد سے طلوع آفتاب کے وقت تک کے عرصے میں یعنی رات کو انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، قرآن اس کو لیل کی اصطلاح استعمال کر کے واضح کرتا ہے۔رات کے حواس کو ہم نیند سے وابستہ کر کے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے دن کی نسبت رات کے وقت ہمارے حواس کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے ۔لگ بھگ ستر گنا ہو جاتی ہے۔جب انسانی حواس کی رفتار تیز ہوتی ہے تو جسم پہ سکوت چھا جاتا ہے اس سکوت کو ہم نیند کہتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

خواب دیکھنے کا عمل اسی وقت وقوع پذیر ہوتا ہے جب ہم سو رہے ہوں۔ اسی لئے رات کے حواس کو خواب کے حواس بھی کہا جاتا ہے۔ اب اس بات کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ خواب میں انسان دیکھتا بھی ہے، خواب میں سنتا بھی ہے، بولتا بھی ہے، چھوتا بھی ہے، چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا بھی ہے۔ اور تو اور جنسی تلذذ سے بھی روشناس ہوتا ہے۔ یہ سب حواس کے عمل دخل کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔ دن کے حواس اور رات کے حواس میں بنیادی فرق رفتار کا ہے۔ دن میں ہمارے حواس کی رفتار زمان و مکاں کی جکڑ بندیوں میں محصور رہتی ہے جبکہ خواب میں ان ہی حواس کی رفتار اتنی بڑھ جاتی ہے کہ انسان زمان و مکاں کے فاصلوں کو خاطر میں لائے بغیر اپنے محسوسات سے استفادہ کرتا ہے۔

بالکل اسی طرح جب انسانی حواس کی رفتار ساٹھ ہزار گنا سے بھی بڑھ جاتی ہے تو اس کیفیت کو قرآن پاک لیلۃ القدر کے نام سے جانتا ہے۔ اس رفتار کا ساٹھ ہزار گنا سے زیادہ ہونے کا سراغ بھی ہمیں قرآن خیرٌ من الفِ شھر کہہ کر دیتا ہے۔ یعنی ہزار مہینے سے بہتر ہونے کا اصل مطلب یہ ہے کہ ایک ماہ میں تیس دن اور تیس راتیں ہوتی ہیں، یعنی ہزار مہینوں میں کل تیس ہزار دن اور تیس ہزار راتیں ہوئیں۔ اس نسبت سے اُس ایک رات کے حواس کی رفتار ساٹھ ہزار گنا سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور جب حواس اس رفتار پہ کام کر رہے ہوں تو انسان کو ملائکہ اور روح کا نزول مشاہدے میں آسکتا ہے۔ ورنہ کیا ہر روز اور ہر رات فرشتے اور روح اپنے اپنے کام سرانجام نہیں دیتے؟

اسی طرح موت بھی حواس کی ایک ایسی رفتار قرار پاتی ہے جب حواس خود کو اس جسمانی قید سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر لیتے ہیں۔ جب مادی جسم حواس کی اس بڑھی ہوئی رفتار کا ساتھ نہیں دے پاتا تو روح اس جسم کو چھوڑ کر اس عالم میں منتقل ہو جاتی ہے، جہاں وہ مادی جسم کی قید سے آزاد ہو کر متحرک رہ سکے۔

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہ العالی نے اپنی کتاب 'خواب اور تعبیر' میں اس

Scanned by CamScanner

امر پر شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ انسان کے حواس خواب میں اس کو کیسی کیسی دنیاؤں کی سیر کرواتے ہیں اور کس طرح زمان ومکاں کی نفی کر کے اُس کو لاشعور سے متصل کر دیتے ہیں۔ انہوں نے قرآنِ حکیم میں حضرت یوسفؑ کے بارے میں دی گئی تفصیل کی مدد سے خوابوں کی مدد سے مستقبل کی بابت کی گئی پیشین گوئیوں کی سائنس اور خواب کے علوم کی بابت نہایت بصیرت افروز انکشافات کیے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں انسان اس دنیا میں آتا ہے تو وہ اپنے ساتھ حواس لے کر آتا ہے۔ ساری زندگی وہ انہی حواس سے کام لیتا ہے اور جب اس دنیا سے دوسری دنیا میں جاتا ہے تو اپنے حواس سے کام لینے کا یہ تجربہ ساتھ لے کر جاتا ہے۔ اس دنیا میں ہم ان حواس کو دو طرح سے استعمال کرتے ہیں۔ دن کے حواس یعنی ایسے حواس جو زمان ومکاں میں جکڑے ہوئے اور پابند حواس ہیں اور رات کے حواس یا خواب کے حواس جو دن کے حواس کی نسبت زمان ومکاں کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

وَمَآ اَدْرٰکَ

قرآنِ حکیم میں تیرہ مقامات ایسے ہیں جہاں اللہ رب کریم ما ادراک کہ کر انسان کو اپنے رازوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور دعوتِ تفکر دیتا ہے۔ اُن میں سے صرف یوم الدین کی بابت یہ سوال دو مرتبہ آتا ہے۔ اس طرح سے کل بارہ باتوں کے بارے میں اس انداز سے متوجہ کیا گیا ہے۔ وما ادراک کے حوالے سے دریافت کی گئی بارہ باتیں یہ ہیں۔

لیلۃ القدر، القارعہ، الحاقہ، یوم الفصل، یوم الدین، سقر، سجین، علیون، الطارق، العقبہ، ھاویہ اور الحطمہ۔

غور و فکر کرنے کی عمومی ترغیبات اپنی جگہ اور اس طرح سے 'اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ فلاں چیز کیا ہے؟' کہہ کر اللہ تبارک و تعالیٰ انسان کو جس طرح غور کرنے، عقل دوڑانے اور تلاش و تجسس کرنے کی دعوت دے رہے ہیں اُس سے صرفِ نظر کرنے کا کوئی جواز نہ بنتا ہے اور نہ ہی بننا چاہیے۔ جب اللہ تعالیٰ یہ دریافت کرتے ہیں کہ تمہیں کیا معلوم کہ فلاں چیز کیا ہے؟ تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس چیز کی بابت جو کچھ انسان کے علم میں ہے

Scanned by CamScanner

اللہ اس کو رد کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ انسان اس کی بابت وہ سمجھے جو اللہ اس کو سمجھانا چاہتا ہے۔ مثلاً وما ادراک ماالقارعہ پہ غور کیا جائے تو یہ پوری سورت اسی ایک لفظ قارعہ کی تشریح کرتی ہے۔

سادہ الفاظ میں اس سورت کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔ کھڑکھڑانے والی! کیا ہے کھڑکھڑانے والی؟ اور تجھے کیا معلوم کہ کیا ہے کھڑکھڑانے والی؟ اس روز ہوں گے لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی مانند اور کر دیئے جائیں گے پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی طرح۔ تو جس کے اعمال وزنی ہوں گے وہ ہوگا اپنی مرضی کے عیش میں اور جس کے اعمال ہلکے ہوں گے اس کا مقدر ھاویہ ہے۔ اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ؟ آگ ہے جلا دینے والی۔

غور و فکر کے لئے توجہ کو کسی ایک نکتے پر مرکوز کروانے کے لئے اللہ تعالیٰ پہلی آیت میں القارعہ کہہ کر رک جاتا ہے۔ پھر سوالیہ انداز میں قارعہ کی بابت پوچھتا ہے کہ وہ کیا ہے؟ اور پھر لہجہ بدل کر تنبیہ کے انداز میں دریافت کرتا ہے کہ تمہیں کوئی کیا سمجھائے کہ کیا ہے وہ؟ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ یوم یکون الناس۔ جس کا لغوی مطلب ہوا کہ وہ ایک دن جب لوگ ہو جائیں گے بکھرے ہوئے پتنگوں کی مانند۔ اب یہاں لفظ یکون اس لئے زیادہ غور طلب ہے کیونکہ اس سے اگلی آیت میں پہاڑوں کے لئے تکون (یعنی کر دیئے جائیں گے) کا لفظ استعمال کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ قرآن کے نزدیک یوم کا وہ مفہوم قابل اعتنا نہیں ہے جو ہمارے یہاں عام طور پر مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم ایک دور اور عہد بھی لیا جا سکتا ہے، اور محسوسات کی ایک کیفیت بھی۔ بکھرے ہوئے پتنگوں کی مانند سے کیا مراد ہے؟ انتشار اور بکھرا ہوا ہونا۔ لیکن اس سے زیادہ بہتر مفہوم انتشار حواس کے سبب سمتوں کا احساس نہ رہنا معلوم ہوتا ہے.... اور ایسا وہ ہو جائیں گے... انہیں کیا نہیں جائے گا۔ البتہ کیا پہاڑوں کو جائے گا۔ کسی بات کا ہونا اندرونی اور باطنی وجوہات کی بنا پر ہوتا ہے جبکہ کیا جانا بیرونی اور خارجی قوتوں کے زیر اثر ہوتا ہے۔ یعنی کھڑکھڑانے والی آواز

Scanned by CamScanner

کے زیر اثر انسان کے حواس منتشر ہو جائیں گے اور پہاڑوں کو کشش ثقل سے آزاد کر کے ریزہ ریزہ کر کے ایسے بکھیر دیا جائے گا گویا دھنکی ہوئی اون۔

اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ زیادہ دشوار نہیں رہ جاتا کہ قارعہ کی کیفیت Noise Pollution یعنی بے ہنگم شور کی وجہ سے ہونے والی آلودگی کے نتائج سے لے کر ایٹمی اسلحہ سے پیدا کی جانے والی آواز کی لہروں سے کہیں زیادہ مہیب ہوگی۔ اس آیت میں غور کرنے سے یہ عقدہ بھی وا ہو جاتا ہے کہ آواز کی لہروں کی طاقت کے زیر اثر انسان کے حواس منتشر ہو جاتے ہیں اور آج سائنس کا ایک ادنیٰ سا طالب علم بھی اس بات کو بخوبی جانتا ہے آواز کی ورائے صوت لہروں سے پہاڑوں جیسی ٹھوس چیز کے پرخچے اڑائے جا سکتے ہیں۔ اس آفت سے محفوظ رہنے کا طریقہ قرآن 'فاما من ثقلت موازینہٗ' کہہ کر بیان کرتا ہے۔

اس کا مفہوم اعمال کے بھاری اور وزنی ہونا لیا جائے تو ذہن میں بہت سے ایسے سوال اٹھتے ہیں جو آواز کی لہروں کے تباہ کن اثرات کی توجیہہ کو غلط قرار دینے پر منتج ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں نہایت توجہ اور دھیان سے اس آیت میں لفظ ثقلت جو ثقل سے مشتق ہے اور اس سے اگلی آیت کے لفظ خفت جو خفیف یعنی ہلکے کی بجائے چھوٹے پن کو ظاہر کرتا ہے: کا تقابلی جائزہ لینا چاہئے۔ ان کے بعد موازینہٗ کا لفظ وزن کرنے اور وزنی ہونے کی بجائے 'موازنہ کرنے' سے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔ اب ان آیات میں کس لفظ کا ترجمہ اعمال کیا جاتا ہے؟ یہ بات الگ سے غور طلب ہے۔ اس لئے اس کو ایک طرف رکھتے ہوئے، ہم اس بات پہ اپنا دھیان مرکوز رکھیں کہ اللہ ہمیں اس ذہن و اعصاب کو منتشر کر دینے والی آفت سے حفاظت کا کیا نسخہ عطا فرما رہا ہے تو ہمارے اخلاص، کوشش اور جد و جہد کے نتیجے میں امید ہے کہ یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ اللہ اصل میں انسان کو کیا سمجھانا چاہتا ہے۔

قرآن حکیم کی ترتیب کتابی اور ترتیب نزولی میں یکسانیت نہ ہونے میں بھی حکمت ہے کہ نزولی ترتیب میں پہلے بات کو اشارتاً بیان کر کے ذہنوں کو اس کی طرف متوجہ کیا جاتا

Scanned by CamScanner

اور شعور کو اس سے واقف کروانے کے بعد اُس کی مزید تفصیلات دی جاتی تھیں۔ اس بات کو اس لئے بھی ذہن میں رکھا جانا ضروری ہے کیوں کہ تقریر کے انداز اور ضرورتیں تحریر کے انداز اور ضرورتوں سے بہت مختلف ہوا کرتی ہیں۔ جو بات تقریر میں کئی جملے ادا کر کے واضح کی جاتی ہے اس کو چند فقروں میں ضبطِ تحریر میں لایا جاسکتا ہے اور اسی طرح کچھ باتیں مقرر محض چند ایک الفاظ میں کہہ کر اپنا مفہوم سامعین تک اس فصاحت اور بلاغت سے منتقل کر دیتا ہے کہ اس کو ضبطِ تحریر میں لانے کو کئی صفحات بھی کم محسوس ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ مکہ میں حضور ﷺ کے مخاطب مسلمان نہیں تھے آپ ﷺ کو مشرکین اور کفار کو اپنی بات سمجھانا تھی، اُس لئے مکی سورتوں میں تلمیح اور ایمائیت کا استعمال مدنی سورتوں کی نسبت زیادہ ہے۔ مکتوبی صورت میں قرآن حکیم میں مدنی سورتیں پہلے اور مکی سورتیں بعد میں رکھنے میں یہی حکمت ہے۔ تحریری صورت میں پہلے تمہیدی بیان ہوتا ہے اور پھر اصل بات کو مناسب انداز میں Sum up کیا جاتا ہے۔ یعنی وہی بات جو ابتدائی دور میں تقریری صورت میں اشارتاً بیان ہوئی تھی، بعد میں اسی کو تحریر میں حرفِ آخر کی صورت خلاصہ بنا دیا گیا۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم فاما من ثقلت موازینہٗ پہ غور کرتے ہیں اور اس آیت کریمہ میں مستور بحرِ معنی میں غوطہ زن ہوتے ہیں تو یہ بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پرشور اور پرآشوب دور سے محفوظ رہنے کو یہ بات تعلیم کرتا ہے کہ پس وہ جو دوسروں کی نسبت اپنے اندر زیادہ وزن رکھتا ہے، وہ مزے میں ہوگا اور جو ہلکی اور سطحی ساخت رکھتا ہوگا وہ خفت اور شرمندگی سے خود کو گڑھے میں گرا ہوا محسوس کرے گا اور یہ بات اُس کو اک آگ کی مانند جلاتی رہے گی۔

اب اس بات غور کیا جائے کہ انسان اندر سے بھاری بھرکم اور وزنی کیسے ہوسکتا ہے؟ تو جو لوگ یکسوئی اور ارتکازِ توجہ کی صفات اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں، صرف وہی ذہنی

Scanned by CamScanner

اور محسوساتی انتشار سے بچ سکتے ہیں۔ کسی شور مچاتے مجمع کا سامنا کرنے والے مقرر کی کیفیات کا تجزیہ کرنے سے یہ بات زیادہ بہتر انداز میں سمجھ میں آسکتی ہے۔ جو مقرر لوگوں کے ہجوم کو اپنے سامنے دیکھنے اور اُن کا شور سننے کے باجود اُن کو اپنے اعصاب پہ سوار نہیں ہونے دیتا اور اپنی بات پورے یقین، سکون اور یکسوئی سے سُنا دیتا ہے۔ وہ اس پورے مجمع پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مقرر اپنے اندر ایسی خوبیاں نہیں رکھتا تو مجمع اس کو اڑا کر رکھ دیتا ہے۔

اب اس اخذ کردہ مفہوم پہ ایک تنقیدی نظر بھی ڈال لی جائے تو اعمال کے وزن کی بات میں جو گہرائی تھی وہ اس غور و فکر کے نتیجے میں مزید نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ جب کسی بندے کے اندر یکسوئی اور ارتکاز کی صلاحیت ہوگی تو اُس کے اعمال اور افعال لامحالہ ایسے فرد سے زیادہ بہتر ہوں گے جو ان صفات کو خود میں ابھارنے اور اجاگر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی لئے اس کے اعمال کی جزا اُس کے لئے خوش کن ہوگی اور جو اس میں کوتاہی کا مرتکب ہوگا اس کا خمیازہ بھی خود اسی کو بھگتنا ہوگا۔ قرآنی تعلیمات کا بنیادی مقصد انسان کے اندر مستور صلاحیتوں کی طرف اس کی توجہ اس طرح سے مبذول کروانا ہے کہ وہ اُن کو نہ صرف استعمال کرے بلکہ بھرپور استعمال کرے اور اس میں کسی کوتاہی کو آڑے نہ دے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو کس قدر ارفع اور اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتا ہے اس بات کا اندازہ ہمیں قرآن کی تعلیمات غور کرنے سے ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو بحیثیت خلیفۃ الارض اس قدر توانا اور طاقتور دیکھنا چاہتا ہے کہ آواز کی وہ مہیب فریکوئنسی جو پہاڑوں کے چیتھڑے اڑا سکتی ہو، انسان کے لئے بے اثر ہو۔ یعنی اس سے یہ کنایہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان آواز کی لہروں اور اس کی فریکوئنسیوں کو تسخیر کر لے۔

اس تسخیر کی مثالیں اور حوالے ہی نہیں بلکہ اس کے فارمولے اور اُن فارمولوں پہ عمل کے طریقے اور اُن کی بابت دیگر بھی کچھ ہمیں قرآن حکیم سے ہی دستیاب ہو سکتا ہے۔ شرط

Scanned by CamScanner

واحد وہی ہے یعنی جو کچھ قرآن کہتا اور بتاتا ہے انسان اُس پہ غور و فکر کرے۔ غور و فکر بھی ایسا کہ جب توجہ یک سوئی سے اس کی کسی آیت پہ مرکوز کر دی جائے تو ہماری اُس توجہ میں اتنا ارتکاز ہو کہ ذہن اُس آیت کی گہرائی میں اترتا چلا جائے۔ غواصی نیک نیتی اور خلوص سے کی جائے تو اللہ معنویت کے موتیوں کا پتہ بھی دیتا ہے، اُس راہ پہ چلنے کی ہمت اور توفیق بھی اور پھر موتی بھی عطا کر دیتا ہے.... لیکن جب ہم قرآن فہمی سے اس قدر کتراتے ہوں کہ خود قرآن بھی اپنے مہجور کر دیئے جانے کی بات پر اُتر آئے، لیکن ہم پھر بھی عبرت نہ پکڑیں اور اپنی ہی روش اور ہٹ دھرمی پر اڑے رہیں تو جو صورت حال آج ہے، وہ نہ ہوتی تو اچنبھا تھا۔ جس خفت آمیز کسمپرسی کا ہم بحیثیت مسلمان شکار ہیں وہ اسی لئے تو ہے کہ ہم اپنا کوئی وزن ہی نہیں رکھتے بلکہ زیادہ درست بات تو یہ ہے کہ ہم اتنے ہلکے اور بے وقعت ہو چکے ہیں کہ آج یہودیوں کے ہاتھوں کے ایک کھلونے، امریکہ کی آواز پورے عالم اسلام کو لرزا دیتی ہے۔ کیا قعر مذلت میں گرنے کے لئے ہمیں کوئی اور گڑھا بھی درکار ہے؟ کیا اس ذلت آمیز شرمندگی سے بڑھ کر کوئی اور آگ بھی ہوگی؟

Scanned by CamScanner

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو اُس کو جان لیتے ہیں، اُس کو اُس طرح سے پہچان لیتے ہیں جس طرح سے اللہ تعالیٰ خود چاہتا ہے، معرفت الٰہی کا اس طرح سے حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اُس کی معرفت کا حق ہے، اللہ کی ذات وصفات کے عرفان میں جتے رہتے ہیں، اپنے دوست قرار دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کی بابت قرآن حکیم یہ اعلان کرتا ہے۔ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون یعنی 'بیشک اللہ کے دوستوں کو کوئی خوف نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ غمگین ہوتے ہیں۔

اس آیت کریمہ پہ غور وفکر کیا جائے، تو اپنی محدود علمی حدود میں رہتے ہوئے، اس کا جو مطلب اور مفہوم لیا جاتا ہے، اگر اُس کا غیر جانبداری سے جائزہ لیں تو یہ بات کسی اچنبھے سے کم نہیں محسوس ہوتی کہ خوف اور حزن کو محسوس نہ کرنے والے لوگوں کو اللہ اپنا دوست قرار دے رہا ہے۔ یہ بات بادی النظر میں کچھ یوں محسوس ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نڈر اور بے حس لوگوں کو اپنی دوستی کے اعزاز سے مشرف کر رہا ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کو جو نہ کسی سے ڈرتے

Scanned by CamScanner

ہوں، نہ ہی جھجکتے ہوں اور انہیں کسی قسم کی افسوس ناک بات پر دکھ اور حزن بھی نہ ستاتا ہو، اللہ تعالیٰ اپنا دوست قرار دے رہا۔ جب ہم اس ارشادِ ربانی کی روشنی میں اپنا جائزہ لیتے ہیں اور ہم خود میں ان دونوں ہی باتوں کو موجود نہیں پاتے تو ہم اس بات کو یا تو ناممکن قرار دے کر اور یا پھر اس کو کچھ خاص قسم کے افراد کے لئے ایک تحفہ اور عطیہ خداوندی جان کر، خود کو اللہ کے دوستوں کی فہرست میں شامل کرنے کی بات کو سوچنا تک بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس سطحی اندازِ فکر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ہم خود ہی اپنے آپ کو اللہ کی دوستی کا نااہل قرار دے بیٹھتے ہیں۔ اب یہ بات اس حوالے سے اور بھی ناقابلِ فہم ہو جاتی ہے کہ ہم خود کو اللہ کی دوستی کا اہل یا نااہل قرار دینے والے کون ہوتے ہیں؟ یہ تو اللہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کس کو اپنی دوستی کے لائق سمجھتا ہے اور کس کو نہیں۔

اس آیت کریمہ پہ غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اولیا، خوف اور حزن کے الفاظ پہ ایک ایک کر کے خوب اچھی طرح غور کریں۔ جب ان الفاظ کا درست اور صحیح مفہوم ہماری سمجھ میں آ جائے گا تو ہم اس آیت کا مطلب بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

جیسا کہ یہ بات سب کے علم میں ہے کہ اولیا اللہ یا ولی اللہ کے الفاظ ایک دینی اور مذہبی اصطلاح کے طور پر اللہ والوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر اللہ والا یا ولی اللہ ایسے تارک الدنیا بزرگ اور خدا رسیدہ شخص کے لئے برتا جاتا ہے جو دنیا کو چھوڑ کر کسی گوشہ عافیت میں بیٹھا، اللہ سے لو لگائے ہوئے ہو۔ اب یہ مفہوم تعلیمات اسلام سے کتنا ٹکراتا ہے اور کس درجے اُن سب کی نفی کرتا ہے، اس بحث میں پڑے بغیر اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان تصورات کے زیر اثر جس کسی کو بھی ولی اللہ یا صاحب ولایت بتایا جاتا ہے اُن کی بابت خود قرآن کہتا ہے کہ اُن کے پاس اس بات کی کوئی سند نہیں ہے کہ وہ اللہ والے ہیں اور اللہ اُن کے کہنے پہ چلتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے تمام تصورات سے پہلو بچا کر اگر ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس آیت میں اس لفظ کا کیا مطلب مراد ہے اور اس کا درست

Scanned by CamScanner

مفہوم کیا ہے؟ تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس آیت میں اس کا سیدھا سادھا مفہوم دوست ہی بنتا ہے۔

اب دوست کسے کہتے ہیں؟ اس بات کو ہر عقل رکھنے والا جانتا ہے کہ دوستی کیا ہوتی ہے اور اس کے تقاضے کیا ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کسی نہ کسی سے دوستی کا کچھ نہ کچھ تجربہ ضرور رکھتا ہے۔ اس مفہوم کے ساتھ اللہ کی دوستی کا مفہوم سمجھیں تو سوال اٹھتا ہے کہ بندہ اللہ کا دوست ہو سکتا ہے یا اللہ بندے کو دوست قرار دیتا ہے یا یہ دونوں ہی ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہو جاتے ہیں؟

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہ العالی کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات صمدیت سے متصف ہونے کے سبب بندے کی دوستی سے بے نیاز ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کا اس طرح سے والی اور مددگار ہو جاتا ہے کہ بندے کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی میرا حمایتی، مددگار اور دوست نہیں ہے۔ اب وسیع تر اور درست مفہوم میں تو اللہ ہی سب کا مددگار اور تمام مخلوق کے کام آنے والی ذات ہے تو پھر یہ اولیا اللہ کون ہیں؟ اولیا اللہ وہ قدسی النفس لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اندر یہ احساس بیدار رکھتے ہیں اللہ ہی میرا حمایتی، مددگار اور دوست ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے وہ اللہ کو اسی طرح سے محسوس کرتے ہیں جس طرح ایک دوست کی موجودگی کو محسوس کیا جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں دراصل اللہ تعالیٰ اپنی دوستی کی شرائط بیان کر رہا ہے۔ اب وہ شرائط کیا ہیں؟ وہ دو شرائط خوف نہ رکھنا اور حزن نہ کرنا ہیں؟

خوف سے ہمارے یہاں ڈرنا، خوفزدہ ہونا اور دہشت زدہ ہو جانا ہی آتا ہے۔ اس مفہوم کو ذہن میں رکھ کر غور کریں کہ یہ کیسے اور کیوں کر ممکن ہے کہ بندہ خوف سے مکمل طور پر چھٹکارا پالے تو بہت سر ماریں تو بھی عقل اس کیفیت کا احاطہ کرنے میں ناکام رہتی ہے کہ آج کے دور میں افسر سے لے کر بیوی تک، پولیس کے چالان سے لے کر پیچھے سے آتی

Scanned by CamScanner

گاڑی کی ٹکر تک، آنے والے کل سے لے کر موت تک، چوہے سے لے کر شیر تک، سانپ سے لے کر طاعون اور سرطان جیسی بیماروں تک، بے عزتی اور توہین ہونے سے لے کر بے روزگاری تک اور پھر قتل ہونے، لٹنے اور جانی انجانی ان گنت باتوں سے لے کر رب ذوالجلال تک ڈرنے اور خوفزدہ ہونے کی کس کس بات سے انسان بچ سکتا ہے؟ پھر یہ بھی ہے کہ ان میں سے بہت سے خوف انسان کے درست اور محتاط رویے کے ضامن بھی تو ہیں۔

پولیس کے چالان کا ڈر نہ ہو تو شاید کوئی بھی ٹریفک کے قوانین کی پابندی نہ کرے، موت کا خوف نہ ہو تو شاید کوئی بھی مریض مہنگے علاج پر راضی ہی نہ ہو، افسران بالا کے درشت رویے اور سرزنش کا ڈر نہ ہو تو شاید کوئی ماتحت بھی بات نہ مانے، فاقے کا خوف نہ ہو تو شاید کوئی بھی نوکری کرنا ہی گوارا نہ کرے۔ ان سب باتوں پہ بار بار غور کرنے کے بعد جب تک انسان کسی قابل اطمینان نتیجے پر نہیں پہنچ جاتا وہ الجھتا ہی رہتا ہے۔ اکثر لوگ خود کو الجھن سے بچانے کے لئے مزید غور کرنا ترک کر دیتے ہیں یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی سہل پسندی آڑے آ جاتی ہے اور وہ اپنی توجہ کو ادھر ادھر بھٹکنے کی اجازت دے دیتے ہیں اور اپنی نفسانی دلچسپیوں پہ اپنی توجہ صرف کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی اس مرحلہ پہ خود پہ قابو پا لے اور اپنی توجہ کو بھٹکنے یا بھٹکنے نہ دے اور یہ تلاش کرنے بیٹھا رہے کہ آخر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا اصل مفہوم کیا ہو سکتا ہے؟ اس لگاتار ارتکاز توجہ سے توجہ گہرائی میں اترنے کے قابل ہو جاتی ہے اور ذہن میں اصل مفہوم کی سمت کے اشارے واضح ہونے لگتے ہیں۔

اگر انسان اس بات پہ غور کرے کہ خوف کی جتنی بھی ممکن اور امکانی صورتیں ہیں اُن سب میں قدرِ مشترک کیا ہے؟ یعنی قرض خواہ کی آمد کے خوف سے لے کر چور، قاتل اور ظالم کے ظلم سے ڈرنے تک اور اسی طرح اندھیرے اور تاریکی میں ڈرنے سے لے کر جنگل میں اچانک شیر کا سامنا ہونے پر محسوس ہونے والے ڈر تک، جتنی بھی قسم کے خوف ہیں، اُن سب کو الگ الگ چشمِ تصور میں ابھارنے کے بعد ذہن کو اس بات پہ لگائیں کہ خوف کی ان

Scanned by CamScanner

سب تصویروں میں کون سی بات یا کیفیت یکساں طور پر موجود ہے؟

خوف کی کیفیت کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کیفیت میں انسان کے ذہن میں ایک ہی بات ہوتی ہے کہ اب کیا ہوگا؟ یعنی کیا ہوگا، کا خیال انسان کے ذہن کو اس طرح سے جکڑ لیتا ہے کہ وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اس خیال کی تکرار کے نتیجے میں انسانی حواس میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، اُن کو ہم ڈر یا خوف کے نام سے جانتے ہیں۔ خوف کی جو بھی تصویر ہو اس کے پس پشت اسی خیال کی تکرار ہو رہی ہوتی ہے۔ اسی کو اندیشۂ مستقبل بھی کہا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر آنے والے وقت کا سامنا کرنے سے ذہن کو جو گھبراہٹ اور کوفت ہو رہی ہوتی ہے وہ خوف ہے۔

جب ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے تو اسی طرح سے حزن کی تمام ممکنہ صورتوں مثلاً کاروبار میں نقصان ہونا، کسی عزیز رشتہ دار یا دوست کے انتقال کی خبر پر محسوس ہونے والا دکھ یا کسی کام میں ناکامی کا صدمہ وغیرہ، کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ حزن، دکھ، غم اور رنج والم میں جو کیفیت حواس کو جکڑ لیتی ہے وہ اس خیال کے ذہن پر طاری ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ایسا کیوں ہوا یا یہ کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ بالفاظِ دیگر حزن ایک ایسی کیفیت ہے جس کا تعلق ماضی قریب میں ہونے والے کسی نقصان سے ہوتا ہے۔

اب ان مفاہیم کے حوالے سے آیت مذکورہ بالا کا جائزہ لینے سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ اگر وہ اُس کی دوستی اور قربت کا خواہاں ہے تو اس کو اپنے طرزِ فکر کو ان خطوط پہ استوار کرنا ہوگا کہ اُس کے ذہن میں کیا ہوگا اور کیوں ہوا کا سوال تکرار نہ پکڑے۔ جب ذہن اس قابل ہو جاتا ہے کہ ان دو سوالوں کی تکرار کو روک لے یا انہیں سرے سے پیدا ہی نہ ہونے دے تو اُس میں اتنی طاقت اور سکت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کا اللہ سے استوار ربط دوستی میں تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی دوستی کے قابل بنا دیتا ہے تو اس بندے کو پوری کائنات کے باسی احترام کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

اس کیفیت کو حاصل کرنے کا نسخہ یہی ہے کہ جب انسان کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اب کیا ہوگا؟ تو وہ اپنا ذہن اس طرف مبذول کرلے کہ جب اللہ، جو مستقبل کو جیسا چاہے بنا سکتا ،میرا دوست اور ہمدرد ہے تو وہ ایسا ویسا کچھ کیوں ہونے دے گا کہ مجھے نقصان یا تکلیف ہو۔ اسی طرح جب ذہن میں یہ خیال آئے کہ ایسا کیوں ہوا، اس طرح ہونا تو نہیں چاہئے تھا، تو ہماری ذہنی تربیت ایسی ہو کہ ہمارا ذہن اس بات کی طرف متوجہ رہے کہ جو ہوا اُس کا کرنے والا میرا دوست اللہ ہے۔ وہ علیم وخبیر ذات بندے سے اپنی دوستی کے بندھن کے باعث کوئی ایسی ویسی بات کیوں کرے گا، جس سے بندے کو کوئی نقصان ہو یا اس کو کوئی تکلیف پہنچے۔ اس لئے میرے دوست نے جو بھی کیا وہ میری بھلائی کے لئے ہی کیا ہے۔ لہٰذا درست کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ جب دوست پہ اتنا بھروسہ ہو کہ اس کی وجہ سے ہونے والے نقصان پہ ملال نہ ہو تو دوستی پکی اور گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ورنہ تو دوستی ہوئی ہی نہیں۔

خوف میں انسان کے ذہن کا رخ مستقبل کی طرف اور حالت حزن میں ذہن ماضی کی سمت ہوتا ہے۔ ماضی یا مستقبل کی طرف ذہن ہونا کوئی بُری بات نہیں لیکن ملال وتاسف کے حوالے سے ماضی کی طرف متوجہ ہونے سے اور اندیشوں کے ساتھ مستقبل پہ نگاہ رکھنے سے انسان کی توانائی کو ضعف پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی صورت یہ نہیں چاہتا کہ انسان اپنی توانائیاں ضائع کرے یا اُن کے خرچ میں اصراف کرے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ بتاتا ہے مجھ سے دوستی کرلو تا کہ تم توانائی کے لامحدود اور لاختم سورس سے جڑے رہو۔

انبیا کرام نے جن جن باتوں کو نیکی بتایا ہے اور اُن کے کرنے اور کئے جانے پہ اس کو اجر و ثواب کا حقدار قرار دیا ہے، وہ سب انسان کو مزید توانائی فراہم کرنے یا پھر اس توانائی کے مناسب استعمال میں معاون ہیں اور جن جن کاموں سے منع کیا ہے اور اُن کا کیا جانا یا سرزد ہونا بدی اور گناہ قرار دیا گیا ہے، وہ سب انسان کی توانائیوں کے زیاں کی راہیں ہیں۔

Scanned by CamScanner

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو دوسرے انبیا پہ فضیلت اور برتری عطا فرمائی ہے۔ اُس فضیلت اور برتری کو بتانے اور سمجھانے کو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے یہ کام لیا کہ آپؐ نے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہونے والی توانائیوں کو مناسب انداز میں استعمال کرنے اور اُن کا زیاں روکنے کے طریقے بتانے کے ساتھ ساتھ اُن مقاصد کو بھی دوٹوک انداز میں واضح فرما دیا جو ان کے عطا کیے جانے کی اصل اور بنیادی وجوہ اور اللہ کا مطمع نظر ہیں۔

قرآنِ حکیم میں لفظ خوف اکیس مرتبہ اور اس مادہ سے بننے والے دیگر الفاظ ایک سو چار مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ اگر ان تمام سوا سو مقامات کا غیر جانبداری اور احتیاط سے جائزہ لیا جائے تو ہر صاحب ذوق اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ قرآن میں ہر جگہ اس سے مراد ڈرنے اور دہشت زدہ ہونے کی نسبت اس جانکاری کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جو ہوگا یا جو اللہ کرے گا، بہتری لئے ہوئے ہوگا۔

سورہ رحمٰن کی اس آیت پہ غور کیا جائے۔ ولمن خاف مقام ربہٖ جنتٰن۔

(ترجمہ) اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔ اب یہ بات نہایت ہی عجیب سی محسوس ہوتی ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ میرے دوستوں کو کوئی خوف نہیں ہو سکتا اور پھر خود ہی اپنی مخلوق کو ڈرا بھی رہا ہے۔ اور وہ بھی کسی اور سے نہیں خود اپنے آپ سے۔ بادی النظر میں یوں لگتا ہے کہ یہاں تضاد ہے۔ اب یہ تضاد (نعوذ باللہ) قرآن میں تو ہو نہیں سکتا۔ تو پھر یہ جو متضاد باتیں ہیں ان کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے؟ پہلی توجیہہ تو یہی ہے کہ یہ تضاد ہمارے شعور کی محدودیت کے سبب ہے۔ دوسری توجیہہ یہ بنتی ہے کہ ہم بات کو سرسری طور پر سمجھنے کے عادی ہونے کے سبب، اتنا کشٹ اٹھانا گوارا ہی نہیں کرتے کہ ان تمام سوا سو مقامات پہ غور کر کے اُس واحد مفہوم کو تلاش کریں جو ان تمام مقامات پہ یکساں طور پر لاگو ہوتا ہو اور تیسری توجیہہ یہ ہے کہ ہم خود غور و فکر کر کے،

Scanned by CamScanner

تلاش و جستجو سے بات کی تہ تک پہنچنے کی بجائے دوسروں کی بتائی ہوئی بات کو کچھ اس طرح سے قبول کر لیتے ہیں کہ وہ ہماری سوچوں کا سانچہ اور طرزِ فکر بن کر رہ جاتی ہے۔ اللہ کی بتائی ہوئی بات کو جب انسان کی بتائی گئی بات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو تضادات تو جنم لیں گے ہی اور اسی قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑتا ہی رہے گا۔

خوف جیسی کمزور کر دینے والی چیز اُس دینِ حنیف کی اساس کیسے ہو سکتی ہے جو انسان کی توانائیوں کے زیاں کو روکنے کے لئے اس کو جھوٹ، غیبت اور طمع جیسی بیماریوں سے بچاؤ کے جتن کرتا ہو۔ وہ دین جو انسان کو مسجودِ ملائک قرار دیتا ہو وہی دین انسان کو خوف اور ڈر سے اتنا کمزور بنانے پہ کیونکر تُل سکتا ہے کہ وہ اپنے ہی رب کا سامنا کرنے کی ہمت اور سکت ہی کھو دے؟ یہ بات نہایت توجہ طلب ہے کہ خوف بھی کسی اور کا نہیں اسی ربِ ذوالجلال کا جو کہتا ہے کہ میں اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اب بچہ ماں ہی سے خوف کھاتا ہو تو اس کی پرورش کیا فرشتے کریں گے؟ اگر فرشتے کریں گے تو وہ مسجودِ ملائک تھوڑا ہی رہا، وہ تو پروردہ اور محکومِ ملائک ہوا۔

اگر ہم یہ بات تسلیم کر لیں کہ اسلام اور قرآن درحقیقت خوف کو اسی مفہوم میں لیتے ہیں جو اس وقت مروج ہے تو اسلام کی پوری عمارت، اس نیو کی کمزوری کے سبب اتنی کج تو ہو گی ہی کہ اس میں ہمیں تضادات نظر آئیں۔ ان تضادات کو جو فکر کو گھن کی طرح کھاتے ہوئے اسے کمزور بنانے کا سبب ہیں، جب تک انہیں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر غور و فکر کر کے، تحلیل نہیں کیا جائے گا، مسلمانوں کی بیچارگی پہ اللہ ہی نہیں بلکہ کائنات کا ہر باسی بھی ترس ہی کھاتا رہے گا۔ اب یہ ہم پہ ہے کہ ہم دوسروں کو اپنی طرف ترحم آمیز نگاہوں سے ترس کھاتے ہوئے دیکھنا پسند کرتے ہیں یا ہمیں اُن کی آنکھوں میں اپنے لئے احترام اور پسندیدگی زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔ اللہ کے قوانین انسان کی صرف اُنہی خواہشات کی تکمیل کی ضمانت دیتے ہیں جو انسان ارادی یا غیر ارادی طور پر، سوچ سمجھ کر یا بن دیکھے

Scanned by CamScanner

بھالے، اپنے نہاں خانہ دل میں بسائے رہتا ہے۔ وہ خواہشات جن کا ہم اپنی زبان سے تذکرہ تو بہت کریں لیکن وہ ہمارے انر (Inner) کی آواز نہ بن سکیں تو ایسی خواہشات کی تکمیل، اس وقت تک کے لئے موخر رہتی ہے جب تک کہ وہ ہمارے باطن کی صدا نہ بن جائیں۔

Scanned by CamScanner

قَصَصُ الْاَنْبِیَا

اللہ تعالیٰ نے اپنی باتوں کی وضاحت کو قرآن حکیم میں انبیا علیہم السلام کے حالات، واقعات اور ان سے سرزد ہونے والے معجزات بیان کئے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت آدم سے لے کر حضور نبی کریم محمد مصطفےٰ ﷺ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی، رسول اور پیغمبر گزرے ہیں۔ چونکہ حضور ﷺ کی بعثت سے دینِ الٰہیہ کی تکمیل کا مرحلہ طے ہو گیا اس لئے سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا گیا لیکن رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عطا اور فیضان، قرآنِ مجید فرقانِ حمید اور اس اُمّ الکتاب کی تفہیم سے آراستہ، اس کے انوار سے فیضیاب، حضور ﷺ کے علوم کے وارث اولیائے کرام، ہمارے درمیان موجود ہیں اور روزِ آخرت تک موجود رہیں گے۔

قرآنِ حکیم میں کل چھبیس انبیا علیہم السلام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اُن میں سے بعض کا تذکرہ نسبتاً زیادہ تفصیل اور وضاحت سے کیا گیا ہے۔ جیسے حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ، حضرت موسیٰؑ،

Scanned by CamScanner

حضرت بی بی مریمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضور محمد مصطفےٰ ﷺ کا تذکرہ دیگر انبیا کی نسبت زیادہ مرتبہ اور زیادہ تفصیلات کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

انبیا علیہم السلام کے واقعات کو اللہ تعالیٰ ہمارے ذوق سماعت کی تسکین کے لئے یا زور خطابت بڑھانے کو بیان نہیں کرتا۔ ہم کیا ہیں اور ہماری اوقات ہی کیا کہ اللہ ہمیں قصے کہانیاں سنا کر محظوظ فرمائے اور نہ ہی اللہ کا رسولؐ ان کو محض قصہ گوئی کے لئے بیان کرتا ہے۔ اِن واقعات کے بیان کا اصل مقصد تاریخ اور ماضی کی بابت حضور نبی کریم ﷺ کے علم کی دھاک بٹھانا بھی نہیں ہے۔ انبیا کے ان واقعات کے بیان سے ایک طرف اللہ تعالیٰ انسانی شعور کے ارتقاء کی بابت مطلع کرتا ہے کہ کس طرح سے مختلف انبیا نے اپنے سے پیشتر انبیا کی نسبت زیادہ رسائی حاصل کی اور دوسری طرف اُن انبیا کو عطا کئے جانے والے علوم کو، اُن کے واقعات میں اس طرح سے سمو دیا ہے کہ گہرے تفکر کی چابی کے بغیر کوئی اُن علوم تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ یہ احتیاط اس لئے کی جانی لازم آتی ہے کیونکہ علم کا اچھا یا برا استعمال، اس علم کے حامل شخص کی ذہنی تربیت اور کردار کے استحکام ہی کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔ جیسے آگ جلانے کا علم ایک گھریلو عورت کے لئے گھر گرہستی کو چلانے کے لئے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے لیکن یہی علم کسی تخریب پسند کے لئے دوسروں کا گھر جلانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

حضرت آدم کو جو علوم عطا کئے گئے، اللہ تعالیٰ اُن کو علم الاسما کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اُن علوم کی وجہ سے وہ ایک طرف مسجود ملائک قرار پائے لیکن دوسری طرف شیطان کے حسد کا نشانہ بھی بنے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ یہ علم انسان کے مادی شعور کی سکت سے بہت زیادہ ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُس علم کو انسان کے باطنی شعور کا حصہ تو بنا دیا لیکن اُس کے محدود مادی شعور کے سمجھنے کے لئے، اُس کو مرحلہ وار سیکھنے کی سہولت بھی بہم فرما دی۔ علمائے باطن کے مطابق اس علم الاسما کو اللہ تعالیٰ نے چالیس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس علم کا جو

Scanned by CamScanner

باب بھی نوع انسانی کے سامنے لایا گیا، اس باب کو پڑھانے اور لوگوں کو علم کے اُس پہلو سے مانوس اور واقف کروانے کو، اُس علم کا عملی مظاہرہ کسی نہ کسی نبی کے ذریعے کیا گیا۔

حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے اور جانداروں کو طوفان کے بعد کے دور میں منتقل کرنے کے حکم کا دیا جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ انہیں اس کی بابت جو علم دیا گیا تھا، انہوں نے اس کا اظہار کیا۔ حضرت ادریسؑ کو ٹائون پلاننگ کا علم دیا گیا، حضرت یوسفؑ کو تاویل الاحادیث کا علم عطا کیا گیا۔ اس کا اظہار انہوں نے علوم رویا کی صورت کیا۔ یعنی خوابوں کی تعبیر بیان کرنے اور خوابوں کے ذریعے فراہم کی جانے والی الوہی راہنمائی سے استفادے کو جو اقدامات کئے جانے چاہئیں، اُن کو عملی طور پر کر کے بھی دکھایا۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو جو تین معجزات عطا کئے گئے، وہ اُن کے دور کی ضرورتوں کے مطابق درکار علم کا عملی مظاہرہ ہی تو تھے۔ فرعون اور جادوگروں کے علم کا مقابلہ کرنے کو انہوں نے بموجب حکم الٰہی، اللہ سے ہم کلامی کا اظہار کیا۔ اپنے عصا کو جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کا صفایا کرنے، سمندر میں اپنے اور اپنی قوم کے لئے راستہ بنانے اور پھر اسی عصا کو چٹان پر مار کر اس سے بارہ چشموں کو جاری کرنے کے لئے استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کے عطا کئے ہوئے کسی خصوصی علم ہی کا تو اظہار کیا۔ یدِ بیضا کا معجزہ فرعون کو اس کے علم و حکم کی حدود میں عاجز کرنے کا علم تھا، کیونکہ وہ خدائی کا دعوے دار ہونے کے باوجود اس جیسی کوئی مثال لانے پہ قادر نہ تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کو مسیحائی کے علم سے نوازا گیا تو انہوں نے کوڑھی کو شفا دینے، نابینا کو بینا کرنے، بانجھوں کو بال عطا کرنے سے لے کر مردہ جسم میں روح دوڑانے تک کے کام کر کے اس علم کو عملی طور پر برتا اور اور اس کا اظہار کیا تا کہ لوگ مادی وسائل کی مدد کے بغیر بھی مسیحائی کو ممکن مان کر، مسیحائی کا وہ خاص فن اور اس کے لئے درکار علم اُن سے سیکھیں۔

حضور ﷺ علم الاسما کے اُس علم کی پوری کتاب کے حامل اور عامل ہونے کے سبب سرورِ کونین اور سردار الانبیا ہیں۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ کے معجزات کا دائرہ، شق القمر

Scanned by CamScanner

اور سورج کو پلٹانے سے لے کر معراج اور قرآن حکیم کی صورت زماں و مکاں کی حدود اور قیود سے آزاد ہیں۔

قرآنِ حکیم میں انبیا علیہم السلام کی بابت بیان کردہ واقعات اور اُن کے معجزات میں مستور و پنہاں علوم تک رسائی کو ممکن بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان ان واقعات پہ غیر منقسم توجہ اور مکمل یک سوئی سے خوب ڈوب کر غور کرے اور اس قدر غور فکر کرے اور اس تفکر کو اُس وقت تک جاری رکھے، جب تک کہ شعور اِن واقعات کی تہہ میں بہتے علوم کا ادراک کرنے اور انہیں اپنے نظامِ فکر کا حصہ بنانے کے قابل نہ ہو جائے۔

قرآن حکیم میں بیان کیے گئے قصص ہوں یا انبیا کے واقعات اور معجزات.....ان پہ غور و فکر کے لئے سب سے پہلے تو یہ امر ذہن میں واضح ہونا ضروری ہے کہ ان واقعات پہ ایک ایک کر کے باری باری غور کیا جائے۔ جب آپ کسی ایک نبی کے واقعات کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیں گے تو اُس نبی اور اُن واقعات کی ایک تصویری صورت ذہن میں بننا شروع ہو جائے گی۔ چشمِ تصور سے اُن واقعات کو رونما ہوتے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو بہت سے سوال ذہن میں ابھرتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب اپنے اندر تلاش کیے جائیں یا بیرونی طور پر کسی کتاب، استاد یا ساتھی کی مدد لی جائے۔

جب اُن سوالوں کے اطمینان بخش جواب ذہن میں آ جائیں گے تو چشمِ تصور کے سامنے ابھرنے والا خاکہ زیادہ واضح ہوتا جائے گا۔ جواب غیر واضح اور مبہم ہونے کی صورت میں ذہن میں ابھرنے والا خاکہ بھی غیر واضح اور مبہم ہی رہے گا۔ غیر منطقی اور واقعات کے فریم میں فٹ نہ ہونے والے جواب استدلال کی روشنی میں آ کر اپنی وقعت کھو دیتے ہیں لیکن منطقی، حقیقت سے قریب اور واقعات کے فریم میں فٹ ہو جانے والے جوابات سے انسانی تصور کی ضیا آفرینی بڑھ جاتی ہے۔ واقعات ایک متحرک فلم کی مانند ذہن کی سکرین پر ابھرنے لگتے ہیں۔ اس کام میں دلچسپی اور رغبت کے ساتھ ساتھ شغف اور استواری کی شرائط کو بھی

Scanned by CamScanner

ملحوظ خاطر رکھا جائے، تو یہ کام سکت اور ہمت کے تناسب سے جلد ہو جاتا ہے، ورنہ اس میں کچھ وقت تو لگ ہی سکتا ہے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں ان واقعات پہ غور و فکر کرنے کی سب سے احسن صورت یہی ہے کہ جس واقعہ یا نبی کی بابت غور و فکر کیا جائے، اس کی بابت قرآن میں جہاں جہاں بھی کچھ بتایا گیا ہے، اُن تمام مقامات پہ ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس کے بعد وہاں استعمال ہونے والے ہر ہر لفظ کی تہہ تک اترنے کی کوشش کی جائے تو اللہ تعالیٰ گوہرِ مقصود تک رسائی کو سہل اور آسان بنا دیتا ہے۔

اپنے طور پر غور و فکر کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ اس موضوع پہ اس سے پیشتر کسی نے جو کچھ سوچا، سمجھا، بتایا یا تحریر کیا، وہ کیا ہے؟ کسی کی کہی ہوئی بات کو حتمی مان کر اس کی بابت سوچ بچار نہ کرنا، تقلید کی اُن راہوں کی طرف لے جاتا ہے جہاں انسان کا ذہن استدلال سے عاری ہو کر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی کھو دیتا ہے لیکن کسی کی ایسی بات کو جو حقیقت پر مبنی ہو محض اس لئے نہ ماننا کہ کہیں ہم تقلید کا شکار نہ ہو جائیں، کسی طرح سے درست اور احسن نہیں مانا جا سکتا۔ ویسے بھی یہاں بات ہو رہی ہے سوچ بچار اور غور و فکر کرنے کی۔ جب انسان سوچنے لگتا ہے اور غور و فکر سے کام لے سکتا ہے تو وہ حقیقی اور غیر حقیقی کے درمیان امتیاز بھی کر سکتا ہے، اس لئے دوسروں کی بات کو سننے اور اُن کے افکار و خیالات کا جائزہ لینے سے انسان کی اپنی سوچ میں وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہوتا ہے اور اس کی فکر میں گہرائی آتی ہے۔

انبیا کی طرزِ فکر، اُن کو درپیش حالات، ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات، اُن کے کئے ہوئے کام، اُن سے سرزد ہونے والے معجزات، اُن کی کہی اور قرآن میں شامل کی جانے والی باتوں کی بابت جو بھی کام کئے گئے ہیں اُن میں سے اکثر کسی نہ کسی ایک پہلو پہ زیادہ جھکاؤ رکھنے کے سبب ہمہ گیر نہیں کہلا سکتے۔ اس لئے جس نے جو کچھ کہہ یا اور جہاں

Scanned by CamScanner

تک ہمیں پہنچا دیا، اُس کی اِس خدمت کے لئے شکر گزاری کے ساتھ، اُس سے آگے کی منزل ہمارا مطمع نظر ہو تو حقیقت مطلقہ اور ثابتہ تک رسائی کے امکانات بڑھتے ہیں۔

قصص القرآن میں بیان کئے جانے والے یوں تو سبھی واقعات اور قصص اپنی اپنی جگہ اہم ہیں لیکن یہاں نمونے کے طور پر ابوالانبیا حضرت ابراہیمؑ کے واقعات اور اُن کے معجزات کی بابت غور کر کے یہ دیکھنے کی سعی کرتے ہیں کہ اُن واقعات کی تہہ میں موجود بحر معنی میں کیا کیا موتی چھپے ہوئے ہیں۔

قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ پچیس سورتوں میں پھیلا ہوا ہے اور اِن میں سے ایک سورت کا نام آپؑ کی نسبت سے سورہ ابراہیم رکھا گیا ہے۔ آپ کا نام نامی قرآن میں کل ۶۹ مرتبہ لیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ حضور نبی کریم ﷺ کے جد اعلیٰ تھے۔ قرآن میں آپ کے بارے جو کچھ بیان کیا گیا ہے..... اُس کی روشنی میں حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہ العالی نے آپ کے حالات و واقعات کی بابت ایک مبسوط جائزہ اور روحانی سائنس کے حوالے سے آپ کے معجزات کی تشریح اپنی معرکۃ الآرا کتاب 'محمد الرسول اللہ' کی جلد سوم میں پیش کی ہے۔

ہر مسلمان خواہ اُس نے قرآن کو پڑھا ہو یا نہ... نماز میں درود ابراہیمی پڑھ کر حضرت ابراہیم پہ اسی طرح درود و سلام بھیجتا ہے جس طرح وہ نبی کریمؐ پہ درود و سلام بھیجتا ہے۔ درودِ ابراہیمی قرآن کے اس حکم... 'سلام علی ابراھیم'.. (آیت ۱۰۹ سورہ الصّٰفّٰت)... کی تعمیل میں پڑھا جاتا ہے۔ اس سے حضرت ابراہیمؑ کی اہمیت اور اُن کے نقشِ قدم پہ چلنے کی ضرورت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح حج کے دوران قدم قدم پہ حضرت ابراہیم کی یاد دلانے کو... خانۂ کعبہ کی تعمیر، مقامِ ابراہیم کی زیارت، رمی یعنی شیطان کو کنکریاں مارنے کا عمل اور پھر اختتامِ حج پہ قربانی کا عمل فرض کیا جانا، اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرزِ فکر و عمل کو اس قدر پسند

Scanned by CamScanner

فرمایا کہ اُس کو دوسروں کے لئے قابل تقلید قرار دیتے ہوئے ....نماز اور حج جیسی بنیادی عبادات میں اُن کی یاد کو فرض کر دیا ہے۔ اس فرضیت کا مقصد ہماری توجہ کو اُن کی طرز فکر و عمل پہ مرکوز کروانے کو اُن کی یاد اور اُس کی تکرار کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

قربانی کے عمل کی متعدد حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس سے لوگوں میں قربانی کا جذبہ پیدا ہو.....

اس کی ایک حکمت یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اس سے غریب غربا کو گوشت کھانے کو مل جائے...

ماہرین نفسیات کے نزدیک سال میں ایک دفعہ قربانی کرنے اور اپنے ہاتھ سے خون بہانے میں یہ رمز پوشیدہ ہے کہ اس سے انسان کے اندر چھپی وحشت اور درندگی کا علاج ہو جاتا ہے.....

جبکہ علمائے باطن کے نزدیک قربانی کرنے سے قربان کئے جانے والے جانور کے جسمِ مثالی (Aura) کی روشنیاں اور توانائیاں قربانی کرنے والے کے جسمِ مثالی کی توانائی میں جذب ہو کر اُس کو توانا کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ صدقہ کی اصل روح بھی یہی ہے کہ صدقہ کرنے سے، صدقہ کی جانے والی چیز کی توانائیاں، صدقہ کرنے والے کو منتقل ہو کر اُس کو روحانی فائدہ پہنچاتی ہیں۔

لیکن جب ہم اس واقعہ کی تہہ تک پہنچنے کو اس پہ غور و فکر کرتے ہیں جس کو قرآن 'ذبح عظیم' کہتا ہے تو دھیان میں یہ بات آتی ہے کہ اس واقعے میں کوئی ایسی بات بھی ہے جو انسان کی انفرادی فائدے کی حدوں سے ماورا اور ارفع و اعلیٰ ہے۔

• قرآن حکیم اس واقعے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے سورہ الصّٰفّٰت کی آیات ۱۰۰ تا ۱۱۱ میں بتاتا ہے:

Scanned by CamScanner

'(کہا اُس نے) اے رب! بخش مجھ کو کوئی نیک بیٹا... پھر خوشخبری دی ہم نے اس کو ایک لڑکے کی جو ہوگا تحمل والا۔ پھر جب وہ اُس کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہوا تو اس نے کہا۔ اے بیٹے! میں دیکھتا ہوں خواب میں کہ میں تجھ کو ذبح کرتا ہوں۔ دیکھ اس کی بابت تیری کیا رائے ہے؟ اُس نے کہا اے باپ! کر ڈال جو تجھ کو حکم ہوا ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں پائے گا۔ پھر جب دونوں نے اس پر صاد کر لیا اور پچھاڑا اُس کو ماتھے کے بل۔ اور ہم نے اس کو یوں پکارا۔ اے ابراہیم! تو نے سچ کر دکھایا خواب۔ یوں دیتے ہیں ہم بدلہ نیکی کرنے والوں کو۔ بے شک یہی ہے صریح جانچنا۔ اور بدلے میں دیا اُس کو ایک جانور بڑا ذبح کرنے کو۔ اور بنایا اس کو ترکہ آنے والی نسلوں کے لئے۔ سلام ہو ابراہیم پر۔ یوں دیتے ہیں ہم بدلہ نیکی کرنے والوں کو۔ بے شک وہ ہمارے ان بندوں میں سے ہے جو بات مانتے ہیں۔'

ان آیات مقدسہ پہ غور کرنے کے لئے جن باتوں کو سمجھنا ضروری ہے وہ کچھ یوں ہیں۔ اس واقعہ کی روایات سے ہٹ کر دیکھا جائے تو یہ معلوم کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس حالت میں یہ دیکھا کہ وہ اپنے عزیز بیٹے اسماعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں اس کے لئے قرآن 'رویا' کی بجائے 'منام' کا لفظ کیوں برت رہا ہے؟ ماتھے کے بل پچھاڑنے میں کیا حکمت تھی؟ باپ بیٹے دونوں کی رضامندی کا اس میں کیا کردار تھا؟ اللہ کا یہ پکارنا کہ 'تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا'... کیا مفہوم رکھتا ہے۔ اگر یہ بات اللہ تعالیٰ نے حکم کے طور پر کہی تھی کہ اپنا بیٹا ذبح کر دو تو 'تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا' کی بجائے یہ کیوں ارشاد نہ فرمایا کہ واہ! شاباش! تو نے میری بات مان کر میرے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ اور پھر جب کہ بیٹا ذبح بھی نہیں ہوا تو اُس کو ذبح عظیم کہنے کی کیا توجیہہ ہو سکتی ہے؟ 'وفدینٰہ بذبح عظیم' کے الفاظ میں سے جانور کے ذبح ہونے کا قرینہ کیسے نکلتا ہے؟ اور فدیہ کا لفظ کس بات کی غمازی کرتا ہے؟ وہ کیا ہے جس کو آنے والی نسلوں کے لئے ترکہ بنا دیا گیا اور ان سب سے

Scanned by CamScanner

بڑھ کر یہ کہ ایک جانور کی عطا نگی سے نیکوکاری کا اجر دیا جانا، اللہ کی شان جود و عطا کو نہ سمجھنے کے برابر ہی ہو سکتا ہے۔

ان سوالوں کے جواب جب تک روایات کی دھند سے ابھر کر ان پر غیر جانبداری سے غور کر کے معلوم نہیں کیے جائیں گے، ہم ان آیاتِ مقدسہ کے اصل مفہوم کی گرد کو بھی نہیں پا سکیں گے۔

غور و فکر کے عمل میں ذہن میں اٹھنے والے سوالات سے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اندر حقیقت شناسی کی خواہش کی بجائے اعتراض اور تنقید کے جذبات غالب آ رہے ہیں۔ اس بات کا واضح ادراک حاصل ہونا چاہیے کہ کون سا سوال سطحی اور تنقیدی اعتراض ہے اور کون سا تلاشِ حق میں ممد و معاون ہو سکتا ہے؟ جب ذہن اس بات کو جانتا ہو کہ وہ کسی بات پہ نکتہ چینی اور محض کوئی بات بنانے کی بجائے درحقیقت کسی بات کی تہ اور تہہ تک پہنچنا چاہتا ہے، تو اس میں اتنی سکت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ روایات کی دھند کو خاطر میں لائے بغیر بات کا تجزیہ کر کے حقائق کی روشن اور منور راہوں پہ اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اللہ کے ایسے بندے اور نبی ہیں جن کو اللہ نے خلیل اللہ کا خطاب دیا ہے۔ انہوں نے جب لوگوں کو بت پرستی سے روکا تو انہوں نے بتوں کو توڑ کر انہیں نہایت منطقی انداز میں یہ دلیل دی کہ جو بت خود اپنے دفاع تک سے قاصر اور لاچار ہیں اُن کو اپنا رب اور خدا ماننا کسی بھی طور درست اور صحیح نہیں۔ وہ جس بات کو درست مانتے تھے اس کو کہنے اور اس پہ عمل سے نہ تو گھبراتے تھے اور نہ ہی ڈرتے تھے۔

نمرود نے اُن کو آگ میں جلانے کا حکم دیا تا کہ لوگوں کو عبرت ہو اور وہ شاہی مفادات کے خلاف زبان کھولنے کی جرات نہ کر سکیں۔ اس تماشے کو زیادہ موثر بنانے کے لئے اُس نے ایک بڑا الاؤ جلانے کا حکم دیا اور انہیں اُس میں پھینکنے کے لئے منجنیق کا استعمال کیا گیا۔ جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا گیا تو قرآن کے الفاظ کے مطابق "قلنا

Scanned by CamScanner

یٰنار کونی بردا و سلما علی ابراھیم 'یعنی ہم نے کہا کہ اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کے لئے سلامتی ہو جا۔ یہاں اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا کہ 'میں' نے کہا۔ بلکہ ارشاد ہے کہ 'ہم' نے کہا۔ یہ 'ہم' سے کیا مراد ہے؟ اللہ اپنے لئے جمع کا صیغہ کیوں استعمال کرتا ہے؟ اردو میں لکھنوی اور حیدرآبادی تہذیب اور روایات کے تحت واحد متکلم کے لئے 'ہم' کا استعمال اور بات ہے اور اللہ کا 'ہم نے کہا!' کہنا کچھ اور بات ہے۔ وہ بات اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ اپنے ساتھ آگ کے ٹھنڈا ہونے کی خواہش کرنے والے کو بھی ملا رہا ہے۔ کیونکہ یہ بات بھی ہمیں اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ میں اپنے بندے کا ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور کان بن جاتا ہوں اور پھر وہ میرے ذریعے دیکھتا، سنتا، چلتا پھرتا اور پکڑتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے رات کے حواس میں جب تارے، چاند اور سورج کو باری باری اپنا رب ہونے پر قیاس کر کے اپنے اس خیال کا تجزیہ کیا اور اُن کو ڈوب جانے والا پایا تو وہ بے ساختہ پکار اٹھے کہ ڈوب جانے والا، مجھ سے جدا ہو جانے والا کسی صورت میرا رب نہیں ہو سکتا۔ یعنی انہیں اس بات کا ادراک حاصل تھا کہ رب اپنی صفت ربوبیت کے سبب اپنی مخلوق سے جڑا ہوتا ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ 'میں چھپنے والوں کو دوست نہیں رکھتا' کا اصل مفہوم ہی یہ ہے کہ رب وہ ہوتا ہے جس کی نفی نہیں ہو سکتی۔ حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں کہ رب وہ ہے جس کا انسان کے ضمیر سے جدا ہونا ہرگز ممکن نہیں۔ غیر رب وہ ہے جس کا انسان کے ضمیر سے جدا ہونا ممکن ہے۔ حضرت ابراہیم کے اس قول سے 'انا' کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اسی 'انا' کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے 'نفس' اور اللہ نے قرآن میں 'حبل الورید' فرمایا۔ یہی وہ ذات انسانی یا انا (ضمیر) ہے جس سے اس کا رب جدا نہیں ہو سکتا اور یہی معرفتِ الٰہیہ کا پہلا قدم ہے۔ اگر انا اپنے رب کو خود سے جدا سمجھے تو وہ معرفت الٰہیہ سے محروم رہتی ہے۔

مخلوق میں سے جس کسی کو، جب بھی، اس بات کا ادراک ہو جاتا ہے کہ میرا رب خود میرے اندر موجود ہے اور میرا وجود اسی کے جود و عطا کی ڈوری سے بندھا ہونے کے باعث

Scanned by CamScanner

موجود ہے تو اللہ کا کہا، اُس کا بھی کہنا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جب حضرت ابراہیم اللہ سے یہ سوال دریافت کرتے ہیں کہ اے اللہ! مرنے کے بعد تو مرے ہوؤں کو کس طرح دوبارہ زندہ فرمائے گا؟ تو اللہ تعالیٰ اُن سے دریافت کرتا ہے کہ کیا تم کو یقین نہیں ہے کہ میں ایسا کر سکتا ہوں؟ اس پر آپ کہتے ہیں کہ مجھے یقین تو ہے لیکن میں مشاہدے کے بعد اپنے اطمینان کی خاطر یہ عمل دیکھنا چاہتا ہوں۔

اس پہ اللہ تعالیٰ اُن کو چار مختلف پرندے لے کر انہیں پالنے اور خود سے مانوس کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ جب وہ پرندے اُن سے خوب مانوس ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن سے کہتا ہے کہ اب ان پرندوں کو ذبح کر کے، ان کا گوشت آپس میں ملا کر انہیں اطراف کے ٹیلوں پر ڈال دو۔ اس کے بعد انہیں پکارو اور پرندے اُن کی آواز پہ لبیک کہتے ہوئے اپنے مادی اجسام کے ساتھ دوبارہ اُن کے پاس حاضر ہو جاتے ہیں۔ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی اس معجزے کی سائنس بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

'کلام الٰہی کے مطابق یقین اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک کہ مشاہدہ نہ ہو۔ دل شعور کا مرکز ہے، قلبی حواس دونوں رخوں میں کام کرتے ہیں۔ قلب کی نگاہ غیب میں بھی دیکھتی ہے اور ایک قدم نیچے اتر کر مادی دنیا میں بھی دیکھتی ہے۔ جب بندہ کسی شے کو غیب اور حضور دونوں میں دیکھ لیتا ہے تو اسے یقین کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ پیغمبر کو اللہ کی جانب سے خصوصی علوم منتقل ہوتے ہیں۔ اِن علوم میں مردوں کو زندہ کرنے کے علوم بھی ہیں اللہ تعالیٰ ایسا خالق ہے جو اول بار بھی پیدا کرتا ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔

علم الیقین کا تعلق روحانی شعور سے ہے۔ جب بندہ اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو روحانی شعور پس پردہ کام کرتا ہے اور روحانی شعور کے ساتھ ساتھ انفرادی شعور (عقل) ہر شے کو علمی سطح کے ساتھ ساتھ عملی سطح پر بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ انفرادی عقل و شعور اس وقت تک

Scanned by CamScanner

مطمئن نہیں ہوتا جب تک کسی شے کو خدوخال کے ساتھ ظاہری حواس میں نہ دیکھ لے۔

مردے کو زندہ کرنے کے عملی تجربے میں اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیتے ہیں کہ پہلے چار پرندے پکڑ کر پال اور اپنے سے اچھی طرح مانوس کر لو تاکہ وہ تمہیں اچھی طرح پہچان لیں اور جب تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری آواز پہچان کر تمہاری جانب اڑ کر آجائیں۔ پہچان کا سب سے بڑا ذریعہ فرد کا نام ہے۔ ہر فرد یا شے کا نام اُس کی مخصوص شخصیت و کردار کا احاطہ کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب سینکڑوں اور ہزاروں میں اُس کا نام پکارا جاتا ہے تو خود وہ ہستی بھی اپنے آپ کو پہچان لیتی ہے کہ کوئی شخص اُسے پکار رہا ہے۔ دوسری بات اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی ہے کہ جب پرندے تم سے اچھی طرح مانوس ہو جائیں، تمہارے اور پرندوں کے درمیان انس و محبت کا رشتہ قائم ہو جائے تب انہیں ذبح کر دو اور ذبح کر کے اُن کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو اور الگ الگ پہاڑوں پر ایک ایک ٹکڑا رکھ دو، پھر تم انہیں اُن کے نام سے پکارو۔ جیسے تم اُن کی زندگی میں ان کو پیار سے بلاتے تھے، مرنے کے بعد بھی جب تم انہیں اسی طرح پکارو گے تو وہ تمہاری طرف دوڑے ہوئے چلے آئیں گے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ مرنے کے بعد پرندوں کے حواس بھی ختم ہو گئے تھے، یہاں تک کہ اُن کے جسموں کے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے اور جسم کے وہ آلات جن کے ذریعے وہ دیکھتے، سنتے اور سمجھتے تھے توڑ دیئے گئے تھے پھر مادی وجود کے ٹوٹنے پھوٹنے کے بعد پرندوں کا وہ کون سا جسم ہے جو مادی حواس کی طرح حواس رکھتا ہے۔ جب اُنہیں اُن کے نام سے پکارا گیا تو وہ فوراً آواز پر متحرک ہو گیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر پرندوں کو پال کر اپنے سے مانوس کر لیا تو یہ اُنسیت حضرت ابراہیمؑ اور پرندوں کے درمیان باہمی ربط بن گئی۔ اس حکم میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ شامل ہو گیا، یہ اُنسیت روح میں واقع ہوئی پرندوں کی روح حضرت ابراہیمؑ کی آواز

Scanned by CamScanner

کی مخصوص لہروں سے واقف تھی۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے پرندوں کو آواز دی تو پرندوں کی روح آپؑ کی آواز کی طرف فوراً متوجہ ہوگئی اور پرندے حضرت ابراہیمؑ کے پاس آگئے۔

حضرت ابراہیمؑ کے پکارنے پر پرندے روشنیوں کے زون سے مادی زون میں آواز کی لہروں پر سفر کرتے ہوئے فوراً اُن کے پاس آگئے۔

' اعلیٰ اور اسفل حواس یعنی زندگی کے تمام اعمال ریکارڈ ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ ازل تا ابد تک پورا کائناتی نظام اللہ کی بنائی ہوئی فلم ہے، ازل میں موجود یہ ریکارڈ (Film) ہی ہے جو عالم ارواح، عالم برزخ اور عالم ناسوت میں مظاہر بن رہا ہے، ہر عالم ایک سکرین کی طرح ہے، اس سکرین پر فلم کا مظاہرہ ہوتا ہے تو دنیا کی ہماہمی اور گہما گہمی ہمیں نظر آتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے پرندوں کے ساتھ شکست و ریخت کا جو عمل کیا اس سے پرندوں کا جسمانی نظام بکھر گیا لیکن پرندوں کی زندگی کا اول و آخر ریکارڈ موجود رہا، جب حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے حکم سے پرندوں کے الگ الگ اعضا کو اکٹھا ہونے کا حکم دیا تو ریکارڈ شدہ نظام بحال ہوگیا اور پرندے زندہ ہوگئے۔ مرنے کے بعد جی اُٹھنے کا تکوینی قانون بھی یہی ہے کہ اللہ کے حکم سے درہم برہم سسٹم "ریکارڈ کے مطابق بحال ہو جائیگا۔ یہ ریکارڈ ہی ہے جو کچھ ہم نے عالمِ ناسوت میں کیا ہے وہ سب بحال ہو جائے گا تو ہاتھ، پیر، آنکھ خود گواہی دیں گے کہ ہم نے اچھے یا برے اعمال کئے ہیں'۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ نے مظاہرات کی صفات کو اس حد تک جان لیا کہ وہ اُن کو جاری کرنے اور ساقط کرنے کی صلاحیت سے متصف ہوگئے تھے۔ آگ کا کام جلانا ہے لیکن حضرت ابراہیمؑ کے لئے بموجب حکمِ خداوندی آگ کو اپنا جلانے کا عمل ساقط کرنا پڑا۔ جس طرح آگ نے جلایا نہیں اسی طرح چھری کی دھار نے کاٹا نہیں۔ اس بات کو ابراہیم نے سوچا کہ چھری کیوں کاٹتی ہے اور کیا اُس کو کاٹنے سے بھی روکا جاسکتا ہے؟ جب

Scanned by CamScanner

اس سوال کی تلاش میں غور وفکر کرتے ہوئے، اُن میں استغراق پیدا ہوا تو وہ حالتِ منام میں داخل ہو گئے۔ اُس حالت میں جو درحقیقت مراقبہ کا ایک ترقی یافتہ درجہ ہے، آپ نے دیکھ لیا کہ چھری کو کاٹنے سے کیونکر روکا جا سکتا ہے۔ اس پر آپ نے اپنی بات کو عملی طور پر آزمانے کے لئے اللہ کے حکم کے مطابق اپنے لاڈلے بیٹے سے اس بات کو بیان کیا۔ بیٹا جانتا تھا کہ اُس کا باپ علم نبوت اور تسخیری فارمولوں سے کس قدر واقف اور مانوس ہے۔ اُس نے جان لیا کہ باپ کو اپنی بات کو عملی صورت دینے کے لئے اُس کی جو معاونت درکار ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے باپ پہ اعتماد کرتے ہوئے خود کو اطاعت گزاری سے اُن کے حوالے کر دے۔ جب آپ اپنے بیٹے کو لے کر چلے تو شیطان نے اُن کو بہکانے کو اُن میں وسواس ڈالنے کی کوشش کی کہ اگر چھری کاٹنے سے نہ رُک سکی اور اس نے کاٹ ڈالا تو دانو پہ لگا بیٹا جان سے جائے گا۔ اس وسوسے اور بہکاوے سے بچ کر جب آپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹایا تو یہ بات اس بات کا ثبوت بن گئی کہ بیٹے کو عام طور پر ذبح کرنے کے انداز میں ذبح کرنا مقصود نہ تھا۔

آپ نے چھری کے کاٹنے کی صلاحیت کو، اُس کی دھار سے الگ کرتے ہوئے جب چھری پھیری تو چھری کاٹنے سے عاجز ہو گئی اور نہ صرف یہ کہ ایک طرف اُس کو کاٹنے سے روک دیا گیا بلکہ اسی لمحہ وہ دوسری طرف کسی اور چیز کو کاٹ دیتی ہے۔ اسی بنا پہ اس کو معجزہ قرار دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ واقعی یہ ایک ذبح عظیم ہے کہ بظاہر تو آپ نے اپنے بیٹے کو ذبح کیا مگر کٹا کچھ اور۔ ذہن میں آنے والے اس مفہوم کا بار بار جائزہ لیں۔ اس مفہوم پہ غور کرنے سے چھری کی دھار کی کاٹ کا، چھری کی مادی شکل وصورت کے بغیر، استعمال کرنے والے فارمولے ذہن میں واضح ہو سکتے ہیں۔

چونکہ ہم بدقسمتی سے ایسے ماحول کے پروردہ ہیں اور ایک ایسے معاشرے میں پلے بڑھے ہیں، جہاں غور وفکر کی حوصلہ افزائی کی بجائے اس کی حوصلہ شکنی کیا جانا ضروری سمجھا جاتا

Scanned by CamScanner

ہم اس ایک اہم سی بات پہ غور کرنا اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ اگر ہم اپنی زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہی غور و فکر اور سوچ بچار کو اپنا شعار بنالیں تو ہم خدا کے بنائے ہوئے نظام کو بہت بہتر انداز میں جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ ہم روزانہ اپنے گھروں میں چھری کا استعمال کرتے ہیں اور اگر کرتے نہیں تو اس کا استعمال ہوتے ضرور دیکھتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں عورتیں سبزی بناتے ہوئے چھری کو اپنے انگوٹھے پہ روکتی ہیں۔ اگر کبھی چھری سبزی کاٹتے ہوئے انگلی پہ لگ جائے اور انگلی سے خون بہنے لگے تو ہم یہی کہتے ہیں کہ دھیان بٹ گیا تھا۔ اس لئے انگلی کٹ گئی لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے کہ وہ انگوٹھا جہاں چھری اکثر ٹکراتی ہے، کیوں نہیں کٹتا؟ یا یہ کہ کبھی کبھار ہی ایسا کیوں ہوتا ہے، ہمیشہ یا اکثر کیوں نہیں ہوتا؟

فارسی میں کہا جاتا ہے کہ بازوئے شمشیر زن.... یعنی تلوار نہیں کاٹتی بلکہ جس ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے وہ کاٹتا ہے۔ اس کا سیدھا اور صاف مطلب یہی ہے کہ انسان کے ذہن کی طاقت کاٹتی ہے، چھری یا تلوار کی دھار مادی شعور کے لئے اس کاٹنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اس بات کو کراٹے جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں اور خالی ہاتھوں چیزوں کو کاٹ کر رکھ دینے کی مشق بھی کرتے ہیں... اور بوقت ضرورت اس صلاحیت کو استعمال بھی کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے ان سب باتوں سے بہت بڑھ کر، اوپر اُٹھ کر ایک علم کو استعمال کر کے دکھایا۔ اُن کی اس ادا پہ خداوند تعالیٰ نے اظہار پسندیدگی فرمایا اور اپنے رسول حضور ﷺ کے ذریعے قربانی کی رسم کو اُن کے اس معجزے کی یاد کے طور پر مسلمانوں میں رائج کر دیا تا کہ لوگ اس پہ غور و فکر کر کے اس کی اصل رمز کو جان لیں اور اس علم کو عملی طور پر برت سکیں۔ اولیائے کرام کے بعض واقعات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ کے علوم کے وارث اولیاء اللہ نے اس علم کو جانا اور برتا۔ انہوں نے یہاں تک بھی کیا کہ آگ نے جلایا نہیں اور پانی نے بھگویا نہیں۔

Scanned by CamScanner

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہ

صوفیا کے نزدیک اللہ کو دیکھنا، اللہ سے باتیں کرنا، اللہ سے عشق کرنا، اللہ سے راز و نیاز کرنا، معرفت اور عرفانِ الٰہی کی منازل سمجھی جاتی ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کی اکثریت اس خیال کی حامی ہے کہ اللہ کو دیکھنا ناممکنات میں سے ہے اور یہ بات.... جنون است وخیال است ومحال است، سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ نحن اقرب الیہ من حبل الورید.. یعنی ہم تو تمہاری رگِ جان سے بھی قریب ہیں، اس لئے اللہ کو دیکھنا لازم آتا ہے۔ اس پہ دوسرا گروہ قرآن ہی کی یہ آیت سامنے لے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا... لن ترانی... یعنی تو مجھے نہیں دیکھ سکتا..... اور جب حضرت موسیٰؑ جیسا جلیل القدر نبی اللہ کو نہیں دیکھ سکا تو ہم گنہگار لوگ ایسی جسارت بھلا کیوں کر سکتے ہیں؟ اس پہ پہلا گروہ کہتا ہے کہ اللہ کا یہ فرمان... و فی انفسکم افلا تبصرون.. اور میں تو تمہارے اندر ہوں، تو پھر تم مجھے دیکھتے کیوں نہیں؟.... ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس قسم کی باتوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ

Scanned by CamScanner

دونوں ہی گروہ اپنی اپنی جگہ اڑے بھی ہوئے ہیں اور بے یقینی کا شکار بھی ہیں، کیونکہ ہر دو اپنی اپنی بات کی تائید میں دلیل تو قرآن سے ہی لا رہے ہیں۔ اس کے سبب جو مانتے ہیں کہ اللہ کو نہیں دیکھا جا سکتا وہ تو خیر کیا دیکھیں گے، وہ جو مانتے ہیں کہ اللہ کو دیکھا جا سکتا ہے وہ بھی الجھن اور خلجان کے باعث، اللہ کو دیکھنے میں کامیابی سے ہم کنار ہونے کو کوشاں ہی ہیں۔

اس قسم کی باتوں پر بحث و تمحیص، مناظرے اور فرقہ بندی کی بجائے کیا یہ بات زیادہ بہتر نہیں کہ ہم اس بات کو خود قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ جب قرآن پہ غور کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق اس کا سمجھنا آسان فرما دیتا ہے۔

قرآن میں جس مقام پہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰؑ سے یہ بات ارشاد فرماتا ہے کہ 'تو مجھے نہیں دیکھ سکتا' اُس پہ غور کیا جائے اور اس بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام تھے، اُن کے دل میں اس بات کی خواہش پیدا ہوئی کہ جس سے وہ بات کر رہے ہیں، اُس کو اپنی نظر کے سامنے دیکھیں بھی، لیکن اللہ تعالیٰ اُن کی اس خواہش کو رد فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ تو مجھے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا اور اپنی بات کو واضح کرنے کو موسیٰؑ سے کہا جاتا ہے کہ سامنے اس پہاڑ کو دیکھتا رہ اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ قائم رہ سکا تو تُو بھی مجھے دیکھ سکے گا اور پھر جب اللہ کی تجلی اُس پہاڑ پہ پڑتی ہے، تو وہ پہاڑ جل کر کوئلہ اور بعض مترجمین کے مطابق دھول بن جاتا ہے اور حضرت موسیٰؑ اپنے ہوش کھو دیتے ہیں۔

اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ کے افلا تبصرون والے حکم پہ غور کرتے ہیں اور اس بظاہر متضاد صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کہی جانے والی بات 'لن ترانی' ایک فرد واحد کے لئے ہے اور افلا تبصرون کا حکم، جمع کا صیغہ رکھنے کے سبب سب کے لئے ہے..... لیکن اس پہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا بات ہوئی کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کو، خود کو دیکھنے کی دعوت دیتا ہے اور دوسری

Scanned by CamScanner

طرف حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر نبی، جن کو کلیم اللہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے.....
یہ کہہ کر منع کر دیتا ہے کہ تم مجھے دیکھنے کی تاب ہی نہیں رکھتے۔

اب اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایسی صورت حال میں جب ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا سوال سامنے آنے لگے تو ہم اپنی سہل پسندی، تساہل اور تن آسانی کے ہاتھوں مزید سوچ بچار سے بچنے کی راہیں تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں اور جب ہمارے پاس متشابہات کی اصطلاح بھی موجود ہو تو ہم اسی کی آڑ لے کر مزید غور و فکر سے نہ صرف یہ کہ خود باز آ جاتے ہیں بلکہ کسی اور کو بھی اس طرف جاتے دیکھ لیں تو آوازہ کسنے سے بھی باز نہیں آتے، لیکن جب کوئی ہمت نہ ہارے اور مستقل مزاجی سے اپنی توجہ حل طلب بات کی طرف مبذول رکھے تو اللہ تعالیٰ گتھی کو سلجھانے کے وسائل عطا کر ہی دیتا ہے۔

جب کوئی بات سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو سب سے بہتر اور محفوظ راستہ قرآن کے الفاظ پہ ایک ایک کر کے غور کرنا اور اُن کو الگ الگ سمجھنے کی کوشش کرنا ہی ہے۔ اس اصول کے تحت جب ہم ان آیات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ لن ترانی میں جہاں اللہ تعالیٰ اپنے دیکھے جانے کو ناممکن بتاتا ہے وہاں لفظ 'را' کا استعمال کیا جا رہا ہے اور جہاں اللہ تعالیٰ '.....تو پھر تم دیکھتے کیوں نہیں؟' فرما رہا ہے، وہاں لفظ 'بصر' لایا گیا ہے۔ اب ان دونوں الفاظ کا مطلب بظاہر ایک ہی ہے یعنی دیکھنا۔ لیکن جب ہم باریک بینی سے، تحقیق اور جستجو کے جذبے سے، ان دونوں الفاظ کے قرآن میں مختلف مقامات پر استعمال کو دیکھتے ہیں اور اس بات پہ غور کرتے ہیں کہ اللہ کن کن مقامات پر دیکھنے کے لئے 'را' کا استعمال کرتا ہے اور کن کن جگہوں پر 'بصر' کا..... تو یہ دیکھ کر انسان پہ وجد طاری ہونے لگتا ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں مادی آنکھوں سے دیکھا جانا مراد ہے وہاں وہاں لفظ 'را' کو برتا گیا ہے اور جہاں جہاں انسان کو اپنی بصیرت اور باطنی نگاہ کو استعمال میں لا کر دیکھنا تجویز کیا گیا ہے وہاں وہاں لفظ 'بصر' صاحبانِ بصیرت کو دعوتِ مشاہدہ دیتا ہے۔

Scanned by CamScanner

سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ یعنی...اور تو دیکھتا ہے کہ وہ تیری طرف تک رہے ہیں اگرچہ وہ کچھ نہیں دیکھ رہے۔اس آیت میں را، نظر اور بصر یعنی دیکھنے کی تینوں حالتوں کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

(یہاں پر مزید حوالوں سے تحریر کو بوجھل بنانے کی بجائے صاحب ذوق قارئین سے درخواست ہے کہ اس بات کو ذہن میں رکھ کر قرآن پاک سے خود مستفیض ہوں۔)

جب یہ نتیجہ سامنے آ گیا کہ را کا لفظ مادی اور جسمانی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اب اس بات کو سمجھنے میں کوئی اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ الا تبصرون کے حکم کے موجب حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کو اپنی باطنی نگاہ سے تو دیکھ ہی رہے تھے اور اُس سے ہمکلام بھی تھے۔ وفورِ محبت سے ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے ایسے دیدار کی خواہش پیدا ہوئی جس سے وہ اپنے اللہ، اپنے رب، اپنے مخاطب کو اپنی مادی آنکھوں سے اپنے مقابل بھی دیکھ سکیں۔ اس پہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس بنیادی راز سے مطلع کرنے کو کہ ہر شئے اُس کی ذات اور صفات کی تجلیات اور انوار پہ قیام پذیر ہے، اُن سے یہ فرمایا کہ اس پہاڑ کو نظر میں رکھ، اگر یہ اپنی مکانیت پہ ٹھہرا رہا تو تو بھی مجھے مادی آنکھ کی نگاہ سے دیکھ لے گا۔ اس آیت کے اصل الفاظ، فان استقرّ مکانہٗ فسوف ترنی، محلِ نظر رہیں تو اس بات کی مزید گہرائیاں خود بخود آشکارہ ہوتی چلی جائیں گی۔ یہاں لفظ مقامہٗ کی بجائے مکانہٗ کا استعمال اس بات کی کیا خوب تشریح کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا کہ یہ اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکے گا بلکہ پہاڑ جس مکانیت پہ قائم ہے وہ برقرار نہیں رہے گی۔ انسان کی مادی نظر مکانیت کی حدود میں دیکھنے کی خوگر ہے۔ اگر نگاہ کسی مکانیت کا احاطہ نہ کر سکے تو وہ ہوا جیسی مادی لیکن لطیف شے کو دیکھنے سے بھی عاجز ہو جاتی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ تو مادی کیا، غیر مادی اشیاء سے بھی لطیف ہے۔

اس کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود کو مادی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش سے

Scanned by CamScanner

اس لئے منع کرتا ہے مادی آنکھیں، محدودیت میں دیکھتی ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کی حدوں سے ماورا اور برتر ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ باطنی نظر کے سامنے جلوہ افروز ہوسکتا ہے کیونکہ باطنی نظر لامحدودیت میں جھانکنے کی صفت سے متصف ہے..... لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ کوئی بھی باطنی نظر جب چاہے اللہ کو دیکھ سکتی ہے۔ لا تدرک الابصار و ھو یدرک الابصار یعنی کسی بصارت کی یہ مجال نہیں کہ وہ اللہ کا احاطہ کر سکے، یہ تو اللہ ہی ہے جو خود جب چاہے اور جیسے چاہے کسی بصارت کے سامنے جلوہ افروز ہو جائے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انسان اپنی......

وہ نگاہ..... جو غیب میں دیکھ سکتی ہے،

وہ نگاہ..... جس سے وہ مادی آنکھوں کے بند ہونے کے بعد خواب دیکھتا ہے،

وہ نگاہ.... جس سے وہ موت کے بعد آراستہ ہو کر اگلے جہاں میں سب کچھ دیکھتا ہے......

اللہ کو دیکھنے کے لئے دستیاب رکھے اور منتظر رہے کہ جانے کب اللہ اس کو اپنے دیدار سے مشرف فرمادے۔

اب فہم کے اس درجے پر ذہن میں جو بالیدگی محسوس ہوتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم اللہ سے عشق کرنے، اللہ سے پیار و محبت کرنے، اللہ کے عشق میں مجنوں بننے اور طلبِ صادق کے ساتھ خود کو اللہ کے دیدار کے قابل بنانے اور اس اعزاز کا اہل ہونے کے فرق کو سمجھیں اور اس بارے میں اپنے رویوں کو درست کریں ورنہ ہمارے خودساختہ مغالطوں کی فہرست میں جہاں اور بہت کچھ غلط ہے وہاں یہ بھی ہماری ناسمجھی کی دلیل بنا رہے گا۔

اگر ہم یہ سوال لے کر قرآن حکیم کا مطالعہ کریں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک ہمارے لئے درست رویہ کیا ہے اور اس کی بابت قرآن حکیم فرقان مجید ہمیں کیا ہدایت دیتا ہے؟ تو ہم سورہ آل عمران کی آیت ۳۱ پہ آ کر رک جاتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

ترجمہ: "آپ کہہ دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو تاکہ اللہ تم سے محبت کرے تمہارے گناہ بخشے... اور اللہ تو ہے ہی غفور الرحیم۔"

اس آیت کریمہ پہ غور وفکر سے انسان کے ذہن کی کئی گرہیں کھل جاتی ہیں اور انسان اس بات کو بخوبی جان لیتا ہے کہ اللہ کی محبت کا دم بھرنے کا اصل طریقہ اتباع رسول کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس میں ایک لطیف بات یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اگر تم اتباع رسول پر کاربند ہو جاؤ گے تو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اس بات پہ رک کر، ٹھہر کر، غور کر کے لطف لینا چاہیے۔ اللہ جس سے محبت کرتا ہے وہ اللہ کا محبوب ہوا۔ عاشق اور محب ہونے کی نسبت محبوب بننے میں جو مزا ہے اُس کو وہی جان سکتا ہے جس کے ناز اس کا محب اٹھاتا ہے۔ ہم جو اللہ کے حبیب، محبوبِ کبریا، حضور نبی کریم ﷺ کی امت ہونے کے دعویدار ہیں ہمیں اللہ کے محبوبؐ کے اتباع میں رسم عاشقی نبھانی چاہیے یا محبوبیت کے سائے میں پناہ تلاش کرنا چاہیے؟ مخلوق اپنے خالق سے عشق کرنے کی مجال کیسے کر سکتی ہے جبکہ ہر تخلیق اپنے خالق کی محبوب ہی ہوا کرتی ہے۔

اس بات کو علامہ اقبالؒ بھی بھانپ چکے تھے تبھی تو انہوں نے کہا تھا:

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو، خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

محبوبیت کی بات کا پتہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے کی حدیث سے بھی ملتا ہے۔ اسی طرح ایک حدیثِ قدسی کے مطابق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو محبت کے ساتھ تخلیق کیا۔ ستر ماؤں سے زیادہ.... کتنا زیادہ؟ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی۔ یہ اکہتر ماؤں کے پیار کی کم از کم حد سے آغاز ہو کر ستر لاکھ یا ستر کروڑ سے ہوتی لامحدود ہو جانے والے پیار کی بات ہے۔ اتنا پیار کرنے والی ذات سے بھلا کوئی عشق کر سکتا ہے؟ انسان اپنی تمام تر محدودیت میں اُس کا پیار سمیٹنے کو محبوب ہی بن جائے تو کوئی کم بات تو نہیں۔

Scanned by CamScanner

حضور نبی کریم ﷺ نے اس دنیا سے پردہ فرمانے سے قبل دعا فرمائی و ھو بل رفیق الاعلیٰ یعنی آپؐ نے اللہ سے اُس کی اعلیٰ ترین رفاقت طلب فرمائی۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے اس بات کا گہرا اور مکمل ادراک ضروری ہے کہ یہ بات وجہ تخلیقِ کائنات، محبوبِ کبریا، رحمت الالعالمین، صاحب قاب قوسین ﷺ اپنے محبِ خالقِ کائنات، رب العالمین سے کہہ رہے ہیں۔ یہ انداز محبوبیت نہ ہوتا تو بات دیدار کی خواہش پر آ کر رُک جاتی..... قربت اور رفاقت کی خواہش میں نہیں ڈھل سکتی تھی۔

Scanned by CamScanner

خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

و من کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون یعنی ہم نے تخلیق کیا ہر شے کو جوڑوں کی صورت تا کہ تم غور کر کے نصیحت پا سکو۔

سورہ ھود، الرعد اور المومنون میں زوجین اثنین (دُہرے جوڑے) کی ترکیب کے استعمال کو دیکھیں تو اس ترکیب کو ایک بار ثمرات الارض اور دو مرتبہ حیوانات کے لئے برتا گیا ہے۔ اسی طرح جب ہم قرآن پاک میں زوج اور اس سے مشتق الفاظ پہ غور کرتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ باری تعالیٰ ہمیں اپنے نظام تخلیق کی بابت مطلع کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ نہ صرف جمادات، نباتات، حیوانات اور جن وانس بلکہ ہر مادی اور مرئی شے کے ساتھ ساتھ غیر مادی اور غیر مرئی شے بھی اپنا اپنا جوڑا رکھتی ہے۔

زمان و مکاں سے لے کر دن اور رات تک، انفس و آفاق سے لے کر، پانی کا جوڑ پیاس سے اور شعور کا..... لاشعور سے جوڑنے تک، خالق کائنات نے ہر شے کا جوڑا تخلیق کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ نر اور مادہ آپس میں جوڑا ہوتے ہیں بلکہ ہر نر اور ہر مادہ اپنی اپنی جگہ پر دہرے پن کے بھی حامل

Scanned by CamScanner

ہوتے ہیں۔ یعنی ہر نر اپنے اندر مادہ کی اور ہر مادہ اپنے باطن میں نر کی خصوصیات بھی رکھتی ہے۔ جنسی کشش کے پس پردہ یہی قانون عمل پذیر ہوتا ہے۔ اگر مادہ کے اندر نر کی صفات مخفی نہ ہوتیں اور نر کے اندر مادہ کی خصوصیات مستور نہ ہوتیں تو کوئی نر کسی مادہ کی طرف رغبت نہ رکھ سکتا تھا اور نہ ہی کسی مادہ میں کسی نر کے لئے کوئی دلچسپی ہو سکتی تھی۔

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی بتاتے ہیں کہ تخلیقی نظام میں جوڑوں کے دہرے پن کی بابت سب سے پہلے حضور قلندر بابا اولیاؒ نے وضاحت فرمائی۔ اُن سے پیشتر کبھی کسی نے اس بات کی تشریح نہیں کی۔ حضور قلندر بابا اولیاؒ کی تعلیمات کے مطابق ہر فرد ایک شعور کا حامل ہوتا ہے۔ اس کو فرد کا شعور کہا جا سکتا ہے۔ اس شعور میں وہ تمام باتیں موجود ہوتی ہیں جو وہ فرد، انفرادی طور پر جانتا اور پہچانتا ہے۔

قانونِ تخلیق کے مطابق شعور کا جوڑا لاشعور ہے۔ یعنی وہ سب کچھ جو ایک فرد شعوری طور پر نہیں جانتا، لاشعور کہلاتا ہے۔ تمام افراد کے شعوروں کے مجموعے کو لاشعور ہی کہا جائے گا۔ اگر اس مجموعے کو ایک نوع کے تمام افراد کے شعوروں کا حاصل مانا جائے تو اس کو نوع کا شعور کہا جاتا ہے۔ یعنی فرد کا لاشعور دراصل اس فرد کی نوع کا شعور ہوتا ہے۔ اس نوعی شعور کے مقابل اس کا جوڑا نوع کا لاشعور ہوتا ہے۔ کسی نوع کا لاشعور درحقیقت تمام انواع کے شعوروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ کسی نوع کے لاشعور کو ہم کائناتی شعور کہتے ہیں۔ اس کائناتی شعور کے مقابل کائنات کا لاشعور ہے۔ اس کائناتی لاشعور کو اللہ تعالیٰ کا ذہن ہی کہا جائے گا۔

حضور قلندر بابا اولیاؒ نے فرد کے شعور کو شعورِ چہارم، نوعی شعور کو شعورِ سوم، کائناتی شعور کو شعورِ دوم اور کائناتی لاشعور کو شعورِ اول کا نام دیا ہے۔ اس شعور تک پہلی بار رسائی حضور نبی کریم ﷺ نے حاصل کی۔ اسی شعورِ اول سے آگاہی اور اس کے انکشاف کو قرآن مقامِ محمود کہتا ہے۔ آپؒ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اب تک نفسیات کے ماہرین نے شعورِ چہارم سے ہٹ کر جس چیز کا سراغ لگایا ہے وہ شعورِ سوم ہے جس کو یہ حضرات اپنی اصطلاح میں لاشعور کا نام دیتے ہیں۔ لیکن قرآن پاک شعورِ اول اور شعورِ دوم کا تعارف بھی کراتا ہے۔

Scanned by CamScanner

شعور چہارم تا شعور اول، سب ایک ہی شعور کے درجے ہیں۔ انسان اپنے شعور کو جس قدر چاہے پھیلا سکتا ہے۔ اس پھیلاؤ اور ترقی کے عمل میں معاونت ہی کی خاطر انبیا نے انسانوں کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ اگر انسان اپنے شعور کی حدوں کو وسعت دینا چاہتا ہے تو انبیا کے بتائے ہوئے راستوں کو اچھی طرح سے سمجھنے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کے علاوہ اور کوئی طریقہ ایسا نہیں ہے جس میں کامیابی کا کوئی امکان ہو۔

شعور اطلاعات کی فراہمی کے لئے حسیات سے کام لیتا ہے۔ انسان مادی شعور کے حوالے سے حواس خمسہ کو ہی حتمی مانے ہوئے ہے لیکن اگر غور و فکر سے کام لے کر دیکھا جائے تو انسان کو محض پانچ حواس نہیں بخشے گئے ہیں۔ ان کی کل تعداد انسانی اندازوں سے بہت زیادہ ہے۔

اگر ان پانچ حواسوں یعنی دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کا جائزہ لیا جائے تو ہم جانتے ہیں کہ ہم میں سے کچھ لوگ ان حسیات کا زیادہ بہتر استعمال کرتے ہیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان میں سے کسی ایک آدھ حس کے استعمال میں دوسروں سے آگے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں میں ان حسیات کے علاوہ اگر کچھ مزید حسیات کام کرتی ہوں تو ہم اُن تمام کے لئے چھٹی حس کی اصطلاح استعمال کر کے اس کی بابت غور کرنا موقوف کر دیتے ہیں۔

تخلیقی قوانین کے مطابق ہر حس دو رخوں کی حامل ہے۔ نہ صرف یہ کہ احساس کرنے والی حس اور محسوس کی جانے والی شے کا آپس میں ایک تعلق ہوتا ہے بلکہ ایک حس بیداری کے دوران جس رفتار سے اور جس طرح کام کرتی ہے، خواب میں اس کی رفتار اور عمل پذیری کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

خواب کی حالت میں حسیات کی رفتار اور قوتِ کار میں اضافے کی سب سے بڑی وجہ زمان و مکان کی پابندیوں کا نرم پڑ جانا ہوتا ہے۔ خواب میں مکانیت ختم تو نہیں ہوتی لیکن اس میں کثافت کی بجائے لطافت بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح وقت کا احساس ختم تو نہیں ہوتا لیکن وہاں انسان اُس ترتیبِ زمانی کا پابند نہیں رہتا جس سے اس کا واسطہ بیداری کے حواس میں رہتا ہے۔ اس کی مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ بیداری میں شام کا وقت دیکھنے کے لئے صبح کو دوپہر، دوپہر کو سہ پہر اور سہ پہر کو

Scanned by CamScanner

شام کرنا لازم ہوتا ہے جب کہ خواب میں ادھر خواب شروع ہوا ادھر سال گزر گیا۔ بعض لوگ خواب میں دیکھتے ہیں کہ انہوں نے ادھر ادھر گھومتے پھرتے چودہ یا بیس سال گزار دیئے۔ اُٹھ کر دیکھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تو اسی شب کا وہی پہر چل رہا ہے جس میں وہ سوئے تھے یا بہت ہوتو دو ایک پہر ہی گزرے ہوتے ہیں۔

اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حواس کی دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح کے حواس، جن کو بیداری کے حواس کہا جاتا ہے، کی رفتار بہت ہی کم ہوتی ہے۔ جبکہ دوسری سطح کے حواس، جن کو نیند یا خواب کے حواس کہا جاتا ہے، کی رفتار بہت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ انسان کا حافظہ جس قدر توانا اور جس قدر ان حواسوں کی کارکردگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اسی نسبت سے وہ خواب میں دیکھے ہوئے مناظر، کئے ہوئے کام اور پیش آنے والے واقعات کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیتا ہے۔ اُن واقعات کو وہ بھلا دیتا ہے جہاں اس کی رفتار حواس کی رفتار کا ساتھ نہیں دے پاتی۔

قرآنی تعلیمات کے مطابق اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ نکالتا ہے رات میں سے دن کو اور دن میں سے رات کو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان شعور اور لاشعور میں اولتا بدلتا رہتا ہے۔ جب وہ شعور میں ہوتا ہے تو ٹائم اور سپیس کی گرفت میں ہوتا ہے اور جب شعور سے نکل کر لاشعور میں داخل ہوتا ہے تو ٹائم اور سپیس کی گرفت سے خود کو آزاد محسوس کرتا ہے۔

انسان اور کائنات کی مخلوق دو حالتوں میں ازلی بدلتی رہتی ہے۔ یعنی ہر مخلوق کی حیات و ممات دو رخوں پر قائم ہے۔ ایک رخ رات اور دوسرا رخ دن۔ ایک رُخ آزاد حواس کا دوسرا رخ پابند حواس کا۔ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی فرماتے ہیں کہ زندگی کے یہ دونوں رخ ہمہ وقت متحرک رہتے ہیں۔ البتہ حواس کے وقفوں کے ساتھ آدمی سپیس میں تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی بیدار ہے۔ اس کی زندگی جن مکانیتوں (Spaces) سے گزر رہی ہے وہ الگ ہیں۔ (Space) سے مراد یہ ہے کہ انسان کا دیکھنا بھی ایک سپیس ہے۔ اس کا سننا بھی ایک سپیس ہے، اس کا چلنا پھرنا بھی ایک سپیس ہے، اس کا سوچنا بھی ایک سپیس ہے۔ یعنی کوئی بھی مخلوق کسی بھی طرح ان مکانیتوں کے دائرہ کار سے باہر نہیں نکل سکتی۔

Scanned by CamScanner

سپیس پر زندگی کی حرکات کے لمحات کا گزرنا ٹائم ہے۔ مثلاً ایک آدمی زمین پر چلنے کے لئے قدم لیتا ہے۔ پہلے وہ زمین پر کھڑا ہے۔ دونوں پیر برابر ہیں۔ جب وہ چلنا شروع کرتا ہے تو ایک پیر اٹھاتا ہے۔ اس کو آگے کی طرف حرکت دے کر زمین پر رکھتا ہے۔ اسی طرح۔ سرا پیر اٹھاتا ہے اور اس کو حرکت دے کر زمین پر رکھ دیتا ہے۔ ایک قدم اٹھانے میں جو فاصلہ طے ہوا وہ سپیس ہے اور جس خلا میں حرکت واقع ہوئی وہ ٹائم ہے۔ اس طرح جب آدمی ایک قدم اٹھاتا ہے، اس کا مکانی فاصلہ ایک قدم ہوا اور اس کا زمانی فاصلہ ایک سیکنڈ ہو تو دس قدم فاصلہ طے کرنے میں اس کو دس سیکنڈ لگتے ہیں۔

آدمی سویا ہوتا ہے تو چونکہ اُس کا مادی وجود زمین پر حرکت نہیں کر رہا ہوتا اس لئے اُس کی زندگی ٹائم میں گزر رہی ہوتی ہے۔ یعنی جب آدمی سوتا ہے تو زمانیت میں سفر کرتا ہے اور جب بیدار ہوتا ہے تو مکانیت میں سفر کرتا ہے اور زمانیت اس کے ساتھ سفر کرتی ہے۔

سورہ بقرہ میں مذکور حضرت عزیرؑ کے واقعہ میں جہاں اللہ تعالیٰ اُن سے دریافت کرتا ہے۔ اے عزیرؑ! کتنی دیر تم رہے؟ آپ جواب دیتے ہیں، ایک دن یا اس سے کچھ کم۔ اس پر اللہ تعالیٰ اُن سے فرماتا ہے۔ نہیں تم سو سال تک مردہ پڑے رہے ہو اور اپنے گدھے اور کھانے کو دیکھو۔ گدھا گل سڑ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا لیکن کھانا اسی طرح پڑا تھا۔ اللہ فرماتا ہے یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر پر کس طرح گوشت پوست چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس کو ہماری قدرت کا مشاہدہ ہو گیا تو اُس نے کہا، میں یقین کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس واقعے میں جب حضرت عزیرؑ سو گئے تو اللہ کے بنائے قانون کے مطابق اُن کے حواس زمانیت میں پیوست ہو گئے۔ اللہ نے اس پوسٹنگ کو سو سال کے عرصے پر محیط کر دیا۔ چونکہ ان کے مادی وجود میں کوئی چلت پھرت نہیں ہوئی اس لئے انہوں نے جواب دیا کہ وہ ایک دن سوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کو ایک نشانی بنا دیا تا کہ لوگ اس نشانِ راہ پر غور کر کے اللہ کے قوانین کی کھوج اور تلاش کا سفر جاری رکھ سکیں۔ اللہ نے اس بات کو نشانی اس مفہوم میں ہرگز بھی نہیں فرمایا کہ ہم اس

Scanned by CamScanner

کو کتابوں میں پڑھ کر واہ واہ کر کے سمجھیں کہ ہم نے اللہ کی ستائش کا حق ادا کر دیا۔

اسی طرح حضرت سلیمانؑ کے قصے میں ان کے دربار میں موجود کتاب کا علم رکھنے والا ایک بندہ، اپنے علم کے زور سے ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکنے سے بھی کم وقت میں حضرت سلیمانؑ کے سامنے حاضر کر دیتا ہے۔ وہ اس کام سے عفریت، جو قوم جنات میں سے تھا، پر سبقت حاصل کر لیتے ہیں۔ پلک جھپکنے سے کم وقت میں، کا اندازہ ایک سیکنڈ کا دسواں حصہ بنتا ہے۔ اتنے کم وقت میں ڈیڑھ ہزار میل دور ملک یمن سے ایک ملکہ کے تخت کو یروشلم میں حضرت سلیمان کے سامنے حاضر کرنا جس سائنس کے تحت ممکن ہو سکا تھا، اس کی بابت اللہ کا بندہ، جس کا نام روایتوں میں آصف بن برخیا ہے، بتاتا ہے کہ وہ اس علم سے اس لئے واقف ہے کیونکہ اس کے پاس کتاب کا علم ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ کتاب میں وہ علم موجود تھا جو وقت کی نفی کرتے ہوئے مکانیت کے تمام فاصلے مٹا کر رکھ دے۔

اس پہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت قرآن تو نازل ہی نہیں ہوا تھا تو پھر وہ کس کتاب کی بابت فرماتے ہیں کہ اُن کے پاس کتاب کا علم تھا۔ اگر یہ کتاب اُن کے مذہب کا کوئی آسمانی صحیفہ تھا تو کیا وہ علم اس کلام پاک میں بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہے تو پھر آج تک کسی قرآن کے ماننے والے نے اُس کو عملی طور پر برتا کیوں نہیں؟ اور اگر یہ علم اللہ کی اس آخری کتاب میں نہیں دیا گیا تو اس صورت میں اللہ کے اس فرمان کہ 'کوئی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات ایسی نہیں ہے جو اس کتاب میں بیان نہ کر دی گئی ہو' کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اس کا صریح مطلب یہی ہوا کہ اللہ نے یہ علم اپنی اس آخری کتاب میں بھی بیان فرمایا ہے لیکن ہم میں سے کوئی آصف بن برخیا بننے پر آمادہ و تیار ہی نہ ہو تو کتاب کے اندر موجود علم خود سے اچھل کر تو کسی کے ذہن میں اترنے سے رہا۔

Scanned by CamScanner

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی

سورہ الاعلیٰ میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

'فلاح پائی اُس نے جس نے سنوارا خود کو.....اس ارشاد عالی مقام اور بصیرت افروز پہ غور کرنے کے لئے سب سے پہلے تو یہ دیکھنا لازم ہے کہ تزکیہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ فلاح درحقیقت کیا ہوتی ہے؟ اس کے حصول اور قیام کے لئے ہمیں کن شرائط کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے؟ فلاح اور تزکیہ کو نہ صرف الگ الگ سمجھنا ہوگا بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ تزکیہ سے فلاح کا کیا تعلق بنتا ہے اور فلاح کو تزکیہ سے مشروط کرنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جن کی بابت قرآن کہتا ہے کہ انہیں فلاح نصیب نہیں ہوسکتی اور وہ کون سے کام ہیں جن کے کرنے سے تزکیہ حاصل ہوسکتا؟ جب ہم اپنے ذہنوں میں ان سب باتوں کے وہ جواب بٹھالیں گے جو آیات قرآنی سے براہ راست اخذ کردہ ہوں گے.....تو امید کی جاسکتی ہے کہ ہمارے قول و فعل اور اعمال، قرآنی تعلیمات کی روشنی میں سجنے اور سنورنے شروع ہوجائیں گے۔

ہمارے ذہنوں میں فلاح کا جو مفہوم بیٹھا ہوا ہے، وہ قرآن کے تصور فلاح سے کس

Scanned by CamScanner

قدر مختلف اور دور ہے.... اس پہ کسی تبصرے کی بجائے یہ دیکھنا چاہئے کہ قرآنِ حکیم فلاح کا جو تصور پیش کرتا ہے اس کو ہم کس طرح اپنا سکتے ہیں؟

سورہ بقرہ کی آیت ۵ میں فرمانِ رب کریم ہے:

'وہی تو ہیں جو اپنے رب کی طرف سے دی جانے والی ہدایت پر کاربند رہتے ہیں اور وہی ہیں فلاح پانے والوں میں سے'.... یعنی هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ کے بعد فرمایا هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ .... یہاں پہ فلاح کا تعلق رب کی طرف سے بخشی ہوئی ہدایت کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تزکیہ اور ہدایت الٰہی کے مابین ربط نہ ہو تو وہ تزکیہ فلاح کا حامل نہیں ہو سکتا۔

فلاح کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لینے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ یہ دیکھا جائے کہ کن لوگوں کی بابت قرآن یہ بتاتا ہے کہ اُن کو فلاح نہیں مل سکتی۔ قرآن پاک کے مطالعہ کے بعد اس ضمن میں جو فہرست تیار ہوتی ہے، اُس کے مطابق جھوٹ بولنے والے، ظالم، مجرم، کافر اور ساحر ایسے افراد ہیں جن کو اللہ کے قوانین کے تحت فلاح سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

اللہ کی طرف سے دی جانے والی ہدایت پہ کاربند رہنے والے، اپنے نفسوں کا تزکیہ کرنے والے، مومن، تقویٰ اختیار کرنے والے، اللہ کی راہ میں اللہ کے واسطے جد و جہد کرنے والے، اعمال الشیطان سے اجتناب کرنے والے، اللہ کا ذکر کرنے والے، صاحبانِ بصیرت، عبدیت اختیار کرنے والے، خیر کے کام کرنے والے، توبہ کرنے والے، حزب اللہ میں شامل لوگ، اعمالِ صالحہ کرنے والے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پہ کاربند لوگ، سود نہ کھانے والے افراد، وزنی اعمال والے اور اپنے ہی نفس کی چالوں سے بچ نکلنے والے افراد کی بابت قرآن بتاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو فلاح پائیں گے۔ اس فہرست میں گنوائی جانے والی خصوصیات میں سے چند ایک پہ عمل کرنے اور چند ایک کو ترک کر دینے یا ان کو دلجمعی سے مکمل طور پر اپنانے میں کامیاب ہوئے بغیر فلاح کی امید رکھنا ایسا ہی ہے

Scanned by CamScanner

کہ جیسے کوئی سود سے حاصل ہونے والی رقم سے فلاحی اور خیراتی ادارے بنا کر یہ سمجھے کہ اُس کو فلاح دارین حاصل ہو گئی ہے۔

فلاح سے محروم ہونیوالوں اور فلاح پانے والوں کی جن بائیس خصوصیات کا تذکرہ قرآن پاک میں کیا گیا ہے، ان دونوں پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلاح کا عمومی مفہوم مراد کو پہنچنا، کامیاب ہونا، بہتری پانا، سزا سے چھوٹنا اور بچ نکلنا، بھلائی پانا اور کسی مقابلے میں جیتنا وغیرہ لیا جاتا ہے لیکن اللہ کے نزدیک فلاح کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اس بات کا نہایت احتیاط اور باریک بینی سے جائزہ لینے کے لئے ہم اُن تمام مقامات پہ نظر ڈالیں جہاں جہاں فلاح یا اس کے مشتق الفاظ استعمال ہوئے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ان تمام عمومی مطالب کے ساتھ ساتھ کچھ مزید مفہوم بھی اس میں سمیٹے ہوئے ہے۔

اٹھارہویں پارے اور سورہ المومنون کا آغاز قد افلح المومنون سے ہوتا ہے اور اُس کے بعد گیارہ آیات میں.... اللہ سے ربط میں خشیعت یعنی اللہ کی موجودگی کا احساس رکھنا، فضول گفتگو سے اجتناب کرنا، زکوٰۃ کی ادائیگی میں مستعدی، ناجائز تعلقات نہ رکھنا، اپنی خواہشات کو لگام دینا، امانت داری اور پابندی عہد کے ساتھ ساتھ اللہ سے اپنے ربط اور تعلق کی حفاظت کرنے والوں کو جنت الفردوس کے وارث قرار دیا جانا.... دعوت فکر دیتا ہے کہ ہم یہ تلاش کریں کہ مومنوں کی یہ مزید نو خصوصیات بیان فرما کر اللہ تعالیٰ ہمیں جو تصور فلاح دینا چاہتے ہیں وہ کیا ہے؟

جب ہمارے ذہن میں فلاح کا وہ تصور واضح ہو جائے گا جو خالصتاً قرآنی تصورِ فلاح ہے تو ہمیں اپنے طرزِ فکر کو اس سانچے میں ڈھالنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوگی، جس کا حاصل فلاح کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اعمال انسانی کی بنیاد طرزِ فکر پر ہوتی ہے، اس لئے طرزِ فکر کی اصلاح اعمال کی اصلاح پر منتج ہوتی ہے۔ ورنہ بصورت دیگر جب ہم ایک ایک کر کے

Scanned by CamScanner

کہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ فلاح کے حصول کے لئے اتنے بہت سے کام کرنے کی شرط شاید فلاح کے حصول کو دشوار تر بنانے کے لئے کی گئی ہے.... تو ہماری سہل پسندی اور تن آسانی آڑے آنے لگتی ہے اور نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ ہم سے کوتاہی سرزد ہونا شروع ہو جاتی ہے، جو رفتہ رفتہ تساہل سے بڑھ کر غفلت بن جاتی ہے۔

جب فلاح کی اُس صورت کو ذہن میں اجاگر کیا جاتا ہے جو تزکیہ سے حاصل ہوتی ہے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فلاح ایک باطنی کیفیت ہے جب کہ اس کی دیگر زیادہ تر صورتیں اعمالِ ظاہری اور خارجی سے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ تزکیہ ہونے کے بعد انسان کے اندر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، دیگر بیان کردہ صورتیں اُس کیفیت کا عملی اظہار ہوتی ہیں۔

اس لئے ہمیں تزکیہ کا فکر عمیق سے جائزہ لے کر دیکھنا چاہئے کہ قرآن اس کا اصل مفہوم کیا بیان کرتا ہے۔ زکّی کا لغوی مطلب پاک کرنا، صاف کرنا، میل کو دور کرنا وغیرہ ہے۔ زکوٰۃ کا لفظ بھی اسی سے مشتق ہے۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ' (پیغمبرؐ) سناتا ہے ان کو آیات، سکھاتا ہے کتاب اور حکمت اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے'۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے۔ ' (پیغمبرؐ) سناتا ہے ان کو آیات، اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور سکھاتا ہے کتاب اور حکمت اُن کو'۔ یعنی ایک جگہ آیات کی تلاوت، کتاب اور حکمت کی تعلیم سے تزکیہ کیا جانا بتایا گیا ہے اور دوسری جگہ تلاوت کلام الٰہی سے تزکیہ کرنے کے بعد کتاب اور حکمت کا سکھایا جانا بتایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک طرف آیات الٰہی کی تلاوت سے کتاب سیکھی جاتی ہے، کتاب سے حکمت.... اور حصول حکمت ذریعہ بنتا ہے تزکیہ کا..... جبکہ دوسری طرف آیاتِ قرآنی سے تزکیہ نفس ہونے کے بعد کتاب کا علم اور اُس کی حکمتوں کا عملی استعمال کیا جانا بتایا گیا ہے۔ یعنی ایک طرف تلاوت، علم الکتاب اور حکمت کو تزکیہ کے لئے ضروری بتایا گیا ہے اور دوسری طرف تزکیہ کو علم الکتاب اور حکمت سیکھنے میں معاون بیان کیا گیا ہے۔ یہ

Scanned by CamScanner

دونوں ہی صورتیں حصولِ تزکیہ اور اس میں مزید ترقی کو یقینی بنانے کے لئے بیان کی گئی ہیں۔

اب یہ تمام باتیں اس امر کی دلیل ہیں کہ تزکیہ درحقیقت دراصل باطن کا ہوتا ہے اور تزکیہء باطن سے حاصل شدہ کیفیت کو فلاح کہا گیا ہے۔ یعنی جب انسان اپنے قلب و نظر، عقل و ذہن کی ایسی تطہیر کر لیتا ہے کہ ذہن میں آنے والا کوئی خیال اور دل میں اٹھنے والا کوئی احساس ایسا نہ ہو جو ماسوا سے آلودہ ہو تو اس عمل کو تزکیہ ہونا کہا جاتا ہے اور جب ذہن ماسواء سے ہٹ کر اس ذاتِ برحق میں مشغول و مستغرق ہو جاتا ہے جو فاعلِ حقیقی اور عاملِ واقعی ہے، تو انسان کو فلاح حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی حصولِ فلاح کو قرآن فوزالعظیم کہتا ہے۔

اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان اس دنیا میں آ کر جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے۔ وہ اس ماحول سے جو کچھ سیکھتا ہے، وہ اُسی کو اپنا علم مان لیتا ہے۔ اُس کی ہر سوچ اور ہر فیصلہ اُسی علم کی روشنی میں ہوتا ہے۔ وہ معاشرہ اور اُس کا بخشا ہوا علم فرد کا عقیدہ بن جاتا ہے۔ وہ ہر بات کو انہی عقائد کی روشنی میں جانتا، جانچتا اور پرکھتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہر چیز کو وہ انہی عقائد کی عینک سے دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ اس عینک کے شیشے جس قدر میلے اور دھندلے ہوں، وہ اپنے حالات و واقعات کو اُسی قدر غیر شفاف، غیر واضح اور دھندلا دیکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تزکیہ کا مفہوم یہی ہے کہ اس کی بصیرت کے سامنے چھائے علم کے شیشے صاف اور شفاف ہوں۔ اُن میں کوئی میل، کوئی دھبہ اور کوئی داغ ایسا نہ رہ جائے جو حقائق کو واضح طور پر دیکھنے میں رکاوٹ کا سبب بن سکتا ہو۔ اس صفائی اور تطہیر کے لئے معاشرے کے بخشے ہوئے علم کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ اپنے بھیجے ہوئے نبی برحق ﷺ کے ذریعے اپنا علم عطا کرنے کو تلاوتِ کلام پاک سے کتاب کا علم اور اس علم کے استعمال کی حکمت و صلاحیت سکھانا چاہتا ہے۔ جب انسان اس بات کو سمجھ لیتا ہے اور جوں جوں اُس کی کور نگاہی کا سبب بننے والے میلے شیشے صاف ہونا شروع ہو جاتے ہیں تو یہی کتاب اور حکمت اُس کو ان شیشوں کو مزید اُجلا اور مجلا بنانے میں اُس کی معاونت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی بصارت

Scanned by CamScanner

اور بصیرت اتنی صیقل ہو جاتی ہے کہ وہ ہر منظر کے پس پردہ کام کرنے والی ایجنسی، اللہ کے قوانین اور اللہ کی ذات کے عمل دخل کو واضح طور پر دیکھنے لگتا ہے۔

جب انسانی بصیرت میں اتنی سکت اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ کو محسوس کرنے لگے تو اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، بات چیت یا کام کاج کرتے، ہر وقت اور ہمہ وقت، اُس کو اللہ کی موجودگی کا احساس رہتا ہے۔ وہ کسی بھی کام کو کرتے ہوئے یہ محسوس کرتا اور خوش ہوتا ہے کہ اس کا رب اُس کو یہ کام یوں کرتے پسندیدگی سے دیکھ رہا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اس لئے کرتا ہے کہ اس کا اللہ چاہتا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ وہ اپنے ہاتھ پیر توڑ کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اس بات کو حرزِ جان بنا لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہاتھ پیر اور دیگر قوائے جسمانی اس لئے دیئے ہیں کہ میں ان سے وہ کام لوں جو اللہ چاہتا ہے۔

جب انسان یہ جان لیتا ہے کہ اللہ اُس سے کیا چاہتا ہے تو قرآن اس کیفیت کے حصول کو فلاح پانا کہتا ہے۔ جس فرد کو یہ کیفیت حاصل ہو جاتی ہے اس کے اکتیس یا بتیس ہی نہیں بلکہ تمام اعمال اور افعال اسی سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں جو اللہ کی کتاب اور نبی ؐ کی سنت کا سانچہ ہے۔ اب اس کو ایک ایک کر کے کئے جانے والے کاموں کو کسی فہرست کے مطابق نہیں کرنا پڑتا بلکہ اس کا ہر کام خود بخود ہی اُس فہرست کے مطابق ہوتا چلا جاتا ہے جو کہ قرآن میں کئے جانے والے کاموں کے زمرے میں آتے ہیں۔ اسی طرح اُس سے کوئی ایسا کام سرزد نہیں ہوتا جس سے قرآن منع کرتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کیونکہ وہ قرآن کے اوامر و نواہی کی اصل سپرٹ کو سمجھ لیتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ کسی کام کو منع کرنے یا کئے جانے کا حکم دینے میں اللہ تعالیٰ کی کیا حکمت اور مصلحت پنہاں ہے۔

جب انسان کا ذہن اس سانچے میں ڈھل جاتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پورے قرآنی پروگرام کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ بندے کا تعلق اور رابطہ اللہ سے استوار ہو

Scanned by CamScanner

اور وہ مخلوق خدا کی خدمت میں جو کچھ بھی کر سکتا ہو ضرور کرے۔ علمائے باطن کے نزدیک اقیم الصلوۃ و اتو الزکوۃ ایک مکمل اور جامع پروگرام ہے جس کا اصل مفہوم اور اس کی باطنی تفسیر ہی یہ ہے کہ انسان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق اور ربط استوار ہو اور وہ بندوں کی خدمت بھی کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود بھی اپنی مخلوق کو ہر طرح کے وسائل فراہم کر کے اُن کی خدمت ہی تو کر رہا ہے۔

جوں جوں بندہ اس پروگرام کی حقیقی روح کے مطابق اس پر عمل پیرا ہو کر اللہ سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے، اسی تناسب سے وہ اللہ کی نیابت کی اہلیت حاصل کرتا ہے۔ جس قدر بندہ اللہ کے قریب ہوتا ہے اسی قدر اُس کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا زیادہ بہتر عرفان ہوتا ہے۔ اللہ کی نیابت کا حصول عرفان کے بغیر ناممکن ہے اور نیابت الٰہی کے درجے پر متمکن ہونے کے بعد اس کے عرفان میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ عرفان و آگہی کی اس سطح سے بڑھ کر فلاح کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟

Scanned by CamScanner

مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنَ

اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق ہر ذی روح دنیا میں آتا ہی اس لئے ہے کہ وہ یہاں سے واپس چلا جائے۔ ہر ذی روح کے قیام کی ایک مدت کا تعین کر کے اُس کو اِس دنیا میں بھیجا جاتا ہے تا کہ وہ اِس دنیا میں اپنے قیام کی مدت و عرصہ مکمل کر کے واپس اُس دنیا میں منتقل ہو جائے جہاں اس کو اللہ کی طرف جانے کے باقی مراحل طے کرنا ہوتے ہیں۔ اب اُسے اِس دنیا میں کیوں بھیجا جاتا ہے؟ اُس کے ذمے وہ کیا کام لگایا جاتا ہے جو اُس نے ہوتا ہے؟ یہاں بھیجنے میں اللہ کی حکمت کیا ہے؟ غرض و غائیت کیا ہے؟ اور جب بھیج ہی دیا تو یہاں رہنے کیوں نہیں دیا جاتا؟

ان تمام اور اس دنیا اور یہاں قیام سے متعلق اٹھنے والے تمام سوالوں کے جواب جاننے کے لئے اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ یہاں آنے سے پیشتر انسان کہاں تھا؟ جہاں تھا، وہاں کس عالم میں تھا؟ اس دنیا سے جانے کے بعد وہ کس عالم میں داخل ہوتا ہے؟ اس دنیا میں کئے ہوئے کام کا اجر..... یا نافرمانی کی سزا..... جنت اور جہنم کیا ہیں؟ انسان اس دنیا

Scanned by CamScanner

سے جانے کے بعد کس حال میں رہتا ہے؟ وہاں نہ ختم ہونے والی زندگی کو کیسے بسر کرتا ہے؟ اُس ابدی زندگی میں جو مراحل درپیش ہوتے ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے اور اُن بے حد و بے کنار مسافتوں اور فاصلوں کو طے کرنے کے لئے جن صلاحیتوں اور توانائیوں کی ضرورت ہوتی ہے، کیا اُس نے اس دنیاوی زندگی میں اُن کو بطور زادِ راہ، بہم پہنچانے کی کوئی کوشش کی یا نہیں؟

ان سب اور اِن سے متعلقہ باتوں کی بابت قرآن پاک میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ 'معاد' کہلاتا ہے۔ قرآن حکیم کی متفرق آیات سے جو صورت حال واضح ہوتی ہے، اُس کو اجمالی طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب کچھ نہ تھا تو اللہ تھا۔ اُس ذاتِ برحق نے اپنے ہونے کا اظہار کرنا چاہا۔ اپنے اس چاہنے کو پورا کرنے کے لئے اُس نے ایک پروگرام تشکیل دیا۔ جب اللہ کے 'ذہن' میں اس پروگرام کی تشکیل ہو گئی تو اُس نے اس پروگرام کو عملی شکل دینے، اس کو حرکت میں لانے کے لئے اُس کو 'کُن' کہہ کر حکم دیا کہ ہو جا اور وہ پروگرام اپنی تمام تر جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ مظہر بنتا چلا گیا۔

اللہ کی صفات کے اس مظاہرے کو کائنات کہا گیا۔ اس سٹیج پر کائنات کی جو حالت تھی وہ ایک عمارت کے نقشے کی مانند یا کینوس پر بنی ایک تصویر کی مانند ساکت اور صامت تھی۔ اُس میں حرکت نہ تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے موجوداتِ کائنات کو، جو اُس وقت روح کی صورت میں موجود تھیں، مخاطب کر کے دریافت کیا: 'الست بربکم' یعنی سوال پوچھا.... کیا نہیں ہوں میں... تمہارا رب؟

اللہ تعالیٰ کی اس آواز کے کائنات میں گونجنے سے روحوں کے اندر سماعت متحرک ہو گئی، جب انہوں نے سنا کہ کسی نے ان کو پکارا ہے تو اُن کے اندر اس بات کی تفہیم پیدا ہوئی کہ کسی نے اُن سے کچھ پوچھا ہے۔ اس فہم نے تجسس کو بیدار کیا۔ اس تجسس نے اُن کے اندر بصارت کو مہمیز کیا اور انہوں نے دیکھا کہ اُن کے سامنے اُن کا خالق اور مالک، اُن کا

Scanned by CamScanner

آقا موجود ہے اور وہ اُن سے یہ دریافت کر رہا ہے کہ کیا وہ اُن کا رب نہیں ہے؟

روحوں نے اللہ کو دیکھ کر اس پوچھی گئی بات کے حوالے سے اُس کو جانچا اور اپنے اندر اس بات کو تولا کہ کیا اُن کے سامنے موجود ہستی اُن کا رب ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس کا تجزیہ کرنے کے بعد جب وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اُن سے مخاطب ہستی ہی اُن کا رب ہے تو انہوں نے عرض کی... 'جی ہاں! یعنی بلاشبہ آپ ہی ہمارے رب ہیں۔

موجودات کا انتظام کرنے کو اللہ تعالیٰ نے فرشتے تخلیق کیے۔ اُن کی کارکردگی میں ایک مشینی پن تھا۔ وہ اتنا ہی کرتے تھے جتنا اُن سے کہا جاتا تھا، اسی وقت کرتے تھے جب اُن سے کچھ کرنے کو کہا جاتا تھا۔ وہ خود سے کوئی فیصلہ کرنے یا اپنے طور پر کوئی قدم لینے کی صلاحیت کا استعمال نہ کرتے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے جنات کو وجود بخشا اور ان کو فیصلہ کرنے اور اپنے طور پر اقدامات کرنے کا شعور عطا کیا۔ اس اختیار کے ساتھ ساتھ اُن کو اپنے کیے گئے کاموں کا جواب دہ بھی بنایا گیا۔ اس طرح سے اس مخلوق کو مکلف قرار دیا گیا۔ جب جنات کی اکثریت اپنے فیصلوں اور اپنے طور پر کیے گئے کاموں سے موجب ظلم و فساد بن گئی تو اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ اب میں زمین پر اپنا نائب بناؤں گا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سن کر فرشتوں نے عرض کی۔ اے باری تعالیٰ اگر آپ کسی کو جنات سے بڑھ کر اختیارات سے نوازیں گے تو وہ تو اُن سے بھی زیادہ فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ نہیں تم غلط کہتے ہو بلکہ کہا... 'جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے'۔

اس کے بعد آدم کو تخلیق کیا گیا۔ سڑی ہوئی مٹی کے گارے سے آدم کا پتلا تیار کیا گیا۔ اُس مٹی کے پتلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح میں سے روح پھونکی۔ آدم زمین سے اگنے کی مانند اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تخلیق کو احسن تقویم قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے

Scanned by CamScanner

انہیں علم الاسما سکھایا۔ پھر اُن سے کہا کہ دیگر موجودات کے سامنے وہ اپنے علم کا اظہار کریں۔ جب انہوں نے اُس علم کا اظہار کیا تو اللہ نے فرشتوں، جنات اور دیگر موجودات کو حکم دیا کہ وہ آدم کی برتری کو تسلیم کرنے کو اس کے سامنے اپنی اطاعت کے اظہار کو سجدہ کریں۔

سب نے اللہ تعالیٰ کے حکم پہ آدم کو سجدہ کیا.... لیکن ابلیس نے ایسا نہیں کیا۔ جب اُس سے دریافت کیا گیا کہ اُس نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا تو وہ رعونت اور تکبر سے بولا کہ میں اس سے بہتر ہوں کیونکہ تو نے مجھے آگ جیسی پوتر شے سے وجود بخشا جب کہ اس کو سڑی ہوئی مٹی سے بنایا گیا ہے۔ اس نافرمانی اور گستاخی پر اللہ تعالیٰ نے اُس کو راندۂ درگاہ اور مردود قرار دے دیا۔ اللہ کی یہ بات سن کر وہ مردود اور بھی بپھر گیا اور کہنے لگا کہ میرے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے یعنی اگر مجھے بتا دیا جاتا کہ اس مٹی کے پتلے میں اللہ خود اپنی روح ڈالے گا تو میں بھلا کیوں انکار کرتا۔ تو دیکھ لینا کہ تیرا یہ مٹی کا پتلا بھی، جس کو تو نے میرا افسر بنا دیا ہے، ایسی ہی کور چشمی اور غلطی کا مرتکب ہوگا، جیسی مجھ سے ہوگئی ہے۔ اس پر باری تعالیٰ نے اس کو صاف صاف بتا دیا کہ اگر اس نے بھی ایسی ہی غلطی کی تو میں تجھ سمیت اس کو بھی جہنم میں جھونک دوں گا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے کہا کہ اے آدم تو اپنے زوج کے ہمراہ جنت میں مزے سے رہ اور جہاں سے تیرا جو جی چاہے رغبت اور خوشی سے کھا پی لیکن دیکھ اُس فلاں درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ تیرا دھیان مجھ سے ہٹ جائے گا اور اس میں تیرا ہی نقصان ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بتا دی کہ شیطان کی طرف سے ہوشیار رہنا کیونکہ وہ تیرا دشمن بن چکا ہے۔

حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ جنت میں خوب مزے سے رہنے لگے۔ پھر ایک دن شیطان کا داؤ اُن پر چل گیا۔ اُس نے انہیں ہمیشگی اور ابدیت کی زندگی کا لالچ دے کر بہکایا

Scanned by CamScanner

اور وہ اس درخت کے قریب جانے کی غلطی کر بیٹھے۔ اُس درخت کا پھل کھاتے ہی انہوں نے خود کو برہنہ محسوس کیا اور پتوں سے تن ڈھانپنے لگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن سے دریافت کیا کہ اُن سے یہ غلطی کیوں ہوئی؟

حضرت آدم اور حوا نے شیطان کے برعکس اپنی غلطی فوراً تسلیم کی اور عاجزی اور انکسار کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور رحم کی درخواست کی۔ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ آدم سے یہ غلطی اس لئے ہوئی ہے کہ اُن کا علم محسوساتی تجربات کی بھٹی سے نہیں گزرا ہے۔ اس لئے اُن کو کندن بنانے کو حکم دیا کہ تم یہاں سے نیچے اتر جاؤ۔ دنیا کو تمہارا مستقر بنایا جاتا ہے وہاں ایک مقررہ مدت تک قیام کے لئے وسائل بھی تمہیں دے دیئے جائیں گے۔ اس دوران میری ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ تم میں سے جو میری ہدایت کا اتباع کریں گے اُن پر خوف اور حزن کا سایہ تک نہ پڑنے دونگا لیکن جو میری ہدایت کو ماننے اور اس پہ عمل پیرا ہونے سے انکار کردیں گے، اُن کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور پھر وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے۔

اس تمام روداد کو سامنے رکھتے ہوئے اب یہ طے کرنا کچھ دشوار نہیں رہ جاتا کہ انسان کو دنیا میں اس لئے تو ہرگز نہیں بھیجا جاتا کہ وہ یہیں کا ہو کر رہ جائے۔ اُس کو واپس اپنے وطن جنت کی طرف جانا ہے اور وہاں جا کر اُس کو اللہ کی نیابت کے فرائض سرانجام دینا ہیں لیکن اس کے لئے اللہ کی طرف سے دی گئی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی جو شرط ہے اس کو کوئی جانے ہی نہ اور اگر جان لے تو اُس پہ عمل نہ کرے اور اگر عمل کرے بھی تو بے دلی، بے رغبتی کے ساتھ اتنا ہی کرے جتنا اس کو سہل لگے..... تو ظاہر ہے کہ وہ جنت کی بجائے کہیں اور ہی جا سکے گا۔

- انا للہ و انا علیہ راجعون کا عام طور پر یہی مفہوم لیا جاتا ہے کہ ہم اللہ کی طرف سے آتے ہیں اور اُسی کی طرف پلٹ جاتے ہیں کیونکہ یہاں اس دنیا میں ہمارا آنا، یہاں

Scanned by CamScanner

رہنا اور پھر پلٹ کر واپس جانا سب کچھ روزِ ازل سے ہی طے شدہ امر ہے لیکن اس کے وسیع تر مفہوم کو دیکھا جائے تو ہمارا ہونا، ہمارا دیکھنا، سننا، بولنا، سونگھنا، ذائقہ محسوس کرنا، چھونا، سوچنا، وقت اور سمت کا احساس کرنا، اس دنیا میں رہنا، علم حاصل کرنا وغیرہ یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ اِن سب باتوں کے لئے اپنے وضع کردہ نظام کے مطابق زندگی فراہم کرتا ہے۔ اگر زندگی ہی نہ ہو تو ہم کچھ بھی نہیں ہو سکتے۔

زندگی کیا ہے؟ اس کے بارے میں جتنے منہ اتنی باتوں کے مصداق بہت سی باتیں کہی اور کی جاتی ہیں۔ علمائے باطن کے نزدیک زندگی کی تعریف یہ ہے کہ اللہ کا چاہنا ہی زندگی ہے۔ جب اللہ کسی شے کو وجود بخشنا چاہتا ہے، تو وہ موجود ہو جاتی ہے اور جب تک اس کو موجود رکھنا چاہتا ہے وہ موجود رہتی ہے، یعنی کسی بھی جاندار یا بے جان کا ہونا، باقی رہنا اور فنا ہو جانا سب کا سب اللہ کے چاہنے سے مشروط ہے۔ چونکہ انسان کے اندر اللہ کی روح کام کرتی ہے، اس لئے اصولاً اس کو واپس بھی اللہ ہی کی طرف جانا ہوتا ہے کیونکہ ہر چیز اپنی اصل ہی کی طرف پلٹنے کی پابند ہے۔

اللہ اپنے اس چاہنے کو ہی متاع فرما رہا ہے۔ جب اللہ کسی کو وجود بخشتا ہے اور اس وجود کو زندگی عطا کرتا ہے تو اس میں زندگی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ زندگی کی تمام صفات اللہ ہی کی صفات ہیں لیکن خالق کی زندگی اور مخلوق کی زندگی میں سب سے بڑا فرق لامحدودیت کے علاوہ اُس کا لا احتیاج ہونا بھی ہے۔ مخلوق اپنی زندگی کے لئے وسائل کی محتاج ہے، جبکہ خالق کسی بھی قسم کی احتیاج اور ضرورت سے ماورا اور بے نیاز ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے لئے، خواہ وہ عالم ارواح کی زندگی ہو، اس مادی دنیا کی زندگی ہو یا مرنے کے بعد آنے والی زندگی ہو، کسی نہ کسی طور، کسی ایک یا دوسری قسم کے وسائل کی حاجت رہتی ہے۔ وسائل اللہ فراہم کرتا ہے اور وسائل کی اس فراہمی کو اللہ متاع قرار دیتا ہے اور اس کو حین یعنی اس دنیا میں ایک خاص مدت کے لئے فراہم کر دیتا ہے۔

Scanned by CamScanner

قرآن میں وقت (زمان) کے لئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ ہیں.... دہر، عصر، حین اور وقت۔

دہر زمانِ حقیقی یا وقت کی وہ حالت ہے جس کو لازمان کہا جاتا ہے۔ حضور قلندر بابا اولیاؒ اس کو ادراکِ الٰہیہ بتاتے ہیں۔ حضور ﷺ کی ایک حدیث شریف ہے کہ لا تسبوا الدهر إن الدهر هو الله ، زمانے کو بُرا نہ کہو، اللہ ہی زمانہ ہے۔ زماں کی اس حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ یہ غیر متغیر ہے۔

وقت، زمانِ حقیقی یعنی دہر کا ایک ایسا وقفہ ہے جو ازل تا ابد ہے۔ یہ وقفہ کائنات کو محیط ہے۔ حضور ﷺ کی ایک حدیث ہے۔ لِیْ مَعَ اللہِ وَقْتٌ 'یعنی میں وقت میں اللہ کے ساتھ ہوں۔ اس حدیث شریف میں اسی ازل سے ابد کے درمیانی وقفہ کی بات فرمائی گئی ہے۔

عصر کا مفہوم جیسا کہ سورہ العصر میں برتا گیا ہے، زمانے کا وہ حصہ ہے جو انسانی شعور کا ادراک بنتا ہے۔ انسان کی تمام تاریخ یا جب سے وہ اس کرۂ ارض پر اتارا گیا ہے اس کو عصر کہا جاتا ہے۔

حین مادی زندگی میں وقت کا وہ وقفہ ہے جو انسان کی زندگی کی ابتدا سے اختتام تک محیط ہے۔ سورہ الدھر کی پہلی آیت میں حین من الدھر کے الفاظ اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ حین دھر کا ایک ایسا جزو ہے جو انسان پر انفرادی سطح پر محیط ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں۔ 'حین دراصل ایک خلا (Void) ہے۔ یہ خلا ہی مٹی کے ہر ذرے کی نیچر ہے۔ اسی کو زمانِ غیر مسلسل (Non-serial Time) کہتے ہیں۔ اس خلا میں جب اللہ تعالیٰ حواس پیدا کر دیتا ہے، اور اُن میں ترتیب پیدا ہو جاتی ہے تو حواس ایک مظہر یعنی انسان کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ دہر مصدرِ اطلاعات یعنی سورس آف انفارمیشن (Source of Information) ہے اور حین وہ خلا ہے جہاں یہ

Scanned by CamScanner

اطلاعات حاصل کی جاتی ہیں۔اس خلا میں جو اطلاعات داخل ہوتی ہیں وہ حواس بناتی ہیں۔

انسان اپنی مادی زندگی میں ان حواس کو ایک ترتیب سے استعمال کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے حواس زمانِ مسلسل (Serial Time) کے پابند ہوتے ہیں۔ بیداری میں انسان کو اسی سیریل ٹائم سے واسطہ رہتا ہے۔اسی سیریل ٹائم کو اللہ تعالیٰ 'نہار' کا لفظ استعمال فرما کر واضح کرتا ہے۔حالتِ خواب میں جب یہ حواس سیریل ٹائم کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتے ہیں تو وہ لمحات کی ترتیب سے آزاد ہو کر عمل کرتے ہیں۔اس نان سیریل ٹائم کی حالت کو اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں 'لیل' کے لفظ سے بیان فرماتا ہے۔

اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنے حواس اور اپنے علم کو کس سطح پہ استعمال کرتا ہے۔ متاع الی حین کا مفہوم دنیاوی مال و دولت کو اپنی زندگی کے ایک معین عرصہ تک استعمال کرنے تک ہی محدود رکھتا ہے یا اس کو پھیلا کر اللہ کی طرف سے آنے والی اُن لہروں تک لے جاتا ہے جو اُس خلا میں اُن تصورات کو داخل کرتی ہیں جن کے تحت وہ زندگی گزارتا ہے۔

Scanned by CamScanner

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِم...

'مہر کر دی اللہ نے اُن کے دلوں پر، اور اُن کے کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے، اور ان کے لئے کرب ناک عذاب ہے' (سورہ بقرہ آیت ۷)

اس ارشاد باری تعالیٰ پہ غور و فکر کا آغاز کیا جائے تو ذہن میں سب سے پہلے یہ سوال آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی کسی کے دل اور کانوں پہ مہر کر دی اور اس کی آنکھوں کو بھی ڈھانپ دیا تو پھر اس کی خطاؤں پہ اُس کو کڑی مار کیوں؟ جب کسی کا دل کسی بھی بھلے کام کے لئے بند کر دیا جائے، وہ کسی اچھی بات کو سننے کے قابل ہی نہ رہے اور اس پہ مستزاد یہ کہ اُس سے دیکھنے کی صلاحیت بھی ہٹا دی جائے اور پھر اس کو اس کے بھٹکنے پر مار بھی پڑے تو یہ صورتِ حال کچھ عجیب سی لگتی ہے۔

ہم اس بات پہ کچھ غور کرنے کی زحمت کی بجائے اللہ تعالیٰ کو قادرِ مطلق بتا کر یہ سوچ لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرے، کس کی مجال کہ اُن کے کاموں میں مداخلت کرے لیکن جب ہم ایسا سوچ لیتے ہیں تو کیا اس سے اللہ تعالیٰ کا پورا نظامِ عدل زیرِ بحث نہیں آ جاتا؟ اس

Scanned by CamScanner

طرح تو مجرموں کو روزِ حشر یہ کہنے کا موقعہ مل جائے گا کہ حضور آپ نے خود ہی تو ہمیں باندھ کر ان جرائم کی راہ پہ لگایا اور اب ہمیں کڑے عذاب کی مار بھی برداشت کرنا ہوگی، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ اگر اس بات کو نہایت دھیان سے سوچ سمجھ کر طے نہ کیا جائے تو کوئی اگر احتراماً منہ سے کچھ کہنے کی جسارت نہ بھی کرے تو دل ہی دل میں ضرور اللہ کے نظام میں خامیوں کے لئے شکوہ سنج ہو سکتا ہے۔

اس آیت پہ کوئی کتنا بھی دماغ لڑائے اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ کلام پاک کی اُن چند ایک آیات میں سے ہے کہ کوئی واقفِ رازہائے دروں خانہ ہی اس کا کوئی ایسا حل بتا سکتا ہے جو اس آیت کا اصل مفہوم بتا سکے۔ یہ کلام پاک کی اُن آیات میں سے ہے جن کے مفہوم کی وضاحت صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علم لدنی سے نوازا ہو۔ وہ اپنے باطنی مشاہدے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے فیض کے سبب اس قابل ہوتے ہیں کہ اس قسم کی باتوں کی اصل حکمت کو منشائے ایزدی کی روشنی میں واضح کر سکتے ہیں۔

اللہ کے ایسے ہی مقرب بندوں میں سے ایک بندہ حضور قلندر بابا اولیاؒ حق کی تلاش کرنے والوں کی راہنمائی کے لئے بیان کرتے ہیں کہ اس بات کو سمجھنے کے لئے اصل صورت حال کو جاننا بہت ضروری ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف نیت کا اختیار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی نیت کے حساب سے انسان کو وسائل فراہم کر دیتا ہے۔ اسی نیت کے حوالے سے انسان کو مکلف قرار دیا گیا ہے۔ اگر اللہ نے انسان کو یہ اختیار نہ دیا ہوتا تو جنت اور جہنم کا پورا نظام بے بنیاد ہو جاتا۔ اسی نیت کرنے کی استعداد کی وجہ سے اُس کو اچھائی کے اجر اور برائی کی سزا کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ تو انسان حالات کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہی ہے۔ جیسے حالات ہوتے ہیں اس کو انہی کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔ اچھے انسان بُرے حالات میں بھی بہتری کی تگ و دو کرتے ہیں اور یہی بات ان کو اللہ کی نظر میں اچھا

Scanned by CamScanner

قرار دلا سکتی ہے۔ جب کہ ایک بُرا شخص تو اچھے حالات میں بھی بُرائی کرتا ہے۔ وہ بُرے حالات میں اچھا کیسے کر سکتا ہے؟

انسان کی نیت کو درست رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام کیا ہے کہ انسان کو ضمیر سے آراستہ فرما دیا ہے۔ انسان جو کچھ چاہتا ہے وہ اس کو اختیار کرنے کی نیت کرتا ہے۔ اگر وہ کسی غلط راہ کا انتخاب کر لیتا ہے اور کسی بُرے کام کی نیت کرتا ہے تو اس کا ضمیر اُس کو ٹوکتا ہے، اُس کو ملامت کرتا ہے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اُس کام سے باز آ جائے۔ اب اگر وہ انسان اپنے اندر کی اُس آواز کو نہیں سنتا، بلکہ اس کا گلہ گھونٹ دیتا ہے اور جب یہ عمل کئی بار دوہرایا جاتا ہے یعنی انسان اپنے ضمیر کی آواز کو بار بار دباتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر ضمیر خاموشی اختیار کر لیتا ہے، تو ڈیوٹی پر مامور فرشتے پہلے تو اُس کو درست راہ کے انتخاب کی طرف مائل کرنے کے لئے اس کو ایسی انسپائریشن (Inspiration) دیتے ہیں کہ وہ یہ سوچے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ درست نہیں ہے اور اُس کو اُس سے باز آ جانا چاہیئے لیکن جب وہ فرد اپنی بات پہ جما رہتا ہے اور اپنی اختیار کردہ غلط راہ سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتا تو فرشتے اس حوالے سے ایک رپورٹ تیار کر کے اللہ تعالیٰ کو پیش کر دیتے ہیں۔ اب یہ معاملہ اس قدر گھمبیر صورت اختیار کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر اس کام سے باز آ جانے کا خیال اُس شخص کے دل میں ڈالا جاتا ہے۔

جب انسان اس سٹیج پر پہنچ کر اپنے دل میں حتمی طور پر یہ طے کر لیتا ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ باز آنے والا نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی اس بات پہ مہر لگا دیتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے قلب میں ایک طرح کا عہد کر لیتا ہے کہ آئندہ وہ اسی راہ بد پر گامزن رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اُس کی بات پہ صاد کرنے کو اُس کے کئے ہوئے عہد کو حتمی قرار دے دیتے ہیں۔ اس بات کو قرآن قلب پر مہر کر دینا قرار دیتا ہے۔ جب کسی کے قلب پر اللہ مہر کر دیتا ہے تو اُس کی

Scanned by CamScanner

سماعت کو اس طرح سے Seal کر دیا جاتا ہے کہ اب کوئی اندرونی یا بیرونی آواز اُس کو نیکی کی طرف راغب نہیں کر سکتی۔ اب اس کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ اُس کی بصیرت (عقل) پر بھی کچھ ایسے پردے پڑ جاتے ہیں کہ وہ ظلم و فساد کو بھی اپنی ضرورت کے تحت جائز قرار دے دیتا ہے۔

اس کے بعد وہ ابوجہل بنا، جو جی میں آتا ہے، کرتا ہے۔ اُس کا ضمیر خود اُس کے اپنے ہاتھوں خاموشی کی موت اتر چکا ہوتا ہے۔ رشد و ہدایت پہ مامور فرشتے بھی اس کی مدد سے عاجز ہو چکے ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کا وجود دوسروں کے لئے اذیت اور پریشانی کا سبب بنا رہتا ہے۔ چونکہ یہ سب کچھ خود اُس کی اپنی پسند سے ہوتا ہے.... اس لئے اس کو دیئے جانے والے عذاب کو عذاب عظیم کہا گیا ہے۔

اس وضاحت کے بعد جب اس آیت کے الفاظ پہ ایک ایک کر کے غور کیا جاتا ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں استعمال ہونے والے الفاظ کا لغوی، عمومی اور قرآنی مفہوم کیا ہے؟ ختم اللہ کا ترجمہ مہر کیا جاتا ہے۔ قرآن میں حضور نبی کریمؐ کے لئے خاتم النبیّن کا لقب سلسلۂ نبوت کو ختم کرنے کے حوالے سے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی بات کو حتمی صورت دینے کے لئے قرآن میں لفظ 'ختم' برتا جاتا ہے۔ اس سے 'ختم اللّٰہ' علی قلوبھم' کا مفہوم اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کا اپنے جی میں آنے والی کسی طے شدہ بات کو حتمی صورت دیا جانا ہی بنتا ہے۔

قلوب جمع ہے قلب کی۔ قلب انسان کے مادی جسم میں وہ عضو سمجھا جاتا ہے، جس کی دھڑکن اُس کی رگوں میں خون دوڑانے اور زندگی کا ثبوت بہم پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ قرآن پاک میں قلب اور اس کے مشتق الفاظ جیسے منقلب، یقلب، ینقلبون، منقلبون، قلوبھم، وغیرہ کل ۱۶۸ آیات میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اِن میں سے اکثر جگہوں میں اس کو پلٹانے، واپس پھیرنے، تبدیل کر دینے کے مفہوم میں برتا گیا ہے۔ اس مفہوم کے

Scanned by CamScanner

پیش نظر جب یہ جائزہ لیا جاتا ہے کہ انسانی جسم میں وہ عضو جو خون کو رگوں میں دوڑاتا ہے اُس کو قلب کیوں کہا جاتا ہے اور اگر اس آیت میں وہی عضو مراد ہے تو غور و فکر اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو کونسا عضو استعمال ہوتا ہے؟ کیا وہ بھی دل ہے یا جیسا کہ طبی علوم کے ماہرین بتاتے ہیں، وہ دماغ ہے۔

ہم میں سے اکثر اس اشتباہ کا شکار ہیں کہ قلب ہی وہ عضو ہے جہاں خیالات کی لہریں آتی ہیں اور انسان اُن خیالات کی روشنی میں مختلف اعمال و افعال سرانجام دیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم دماغ کے کردار سے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتے اور اس الجھن میں پڑے رہتے ہیں کہ نہ جانے اصل میں کیا درست ہے اور کیا غلط۔ حالانکہ اگر ہم ایک بار غور کر کے اس مسئلے کو ایک دفعہ سلجھا لیں تو کسی قسم کا کوئی اشتباہ باقی ہی نہ رہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے اطلاعات نشر ہوتی ہیں۔ یہ اطلاعات کائنات کے ذرے ذرے تک پہنچتی ہیں۔ اللہ کے قانون کے مطابق اطلاعات کی یہ لہریں تنزل کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے بالآخر ایک ایسے نکتے یا مقام پر پہنچ جاتی ہیں جہاں سے اُن کی واپسی کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ روحانی علوم کے مطابق اُس مقام کو قلب کہا جاتا ہے۔ اہلِ تصوف اُس کو لطیفۂ قلبی کے نام سے جانتے ہیں۔ اسی رعایت سے جسم کے اُس عضو کو جو خون کو واپس جسم کی طرف پلٹاتا ہے قلب کہا جاتا ہے۔ اس لئے قرآن جس چیز کو قلب کہہ رہا ہے وہ نہ تو دماغ ہے..... جہاں احساسات، محسوسات اور موصولہ اطلاعات کی روشنی میں برقی رو ئیں یا الیکٹرک امپلسز (Elctric Impulses) پیدا ہو کر جسم میں کیمیائی تبدیلیاں اور جسمانی افعال سرانجام دیتی ہیں... اور نہ وہ دل ہے جو خون کو جسم کے لئے پمپ کرتا ہے۔ بلکہ یہ انسانی روح کا وہ مقام ہے جہاں انسان اللہ کی طرف سے آنے والی اطلاعات کو موصول کرتا اور اُن میں سے کچھ کو اختیار کرتا ہے یا رد کرتا ہے۔ اسی سبب سے دل کو آئینہ سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے کیونکہ یہ آئینہ جس قدر صاف اور شفاف ہوتا

Scanned by CamScanner

ہے انسان اپنے من میں آنے والی اطلاعات کو اسی قدر واضح طور پر دیکھتا اور سمجھتا ہے اور جس قدر اس پر تعصب اور جانبداری کا ملمع چڑھا ہوتا ہے..... اللہ کی طرف سے جی میں آنے والی اطلاعات کو دھندلا، غیر واضح اور الجھا ہوا دیکھتا ہے۔ اسی لئے قرآن تزکیہ نفس اور تطہیر القلوب پہ اصرار کرتا ہے تاکہ انسان معاملات کی درست تفہیم سے آراستہ ہو اور غلطیوں سے بچ سکے۔

قلبِ انسانی کو اسی سبب سے اللہ کا گھر بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں آنے والی اطلاعات براہ راست اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ یہاں پہنچنے تک ان اطلاعات میں کسی قسم کی کوئی آمیزش اور کسی قسم کی کوئی ملاوٹ بھی نہیں ہوتی۔ اس سطح کے بعد جب انسان کا نفس ان اطلاعات کو اپنے طور پر معانی پہنانے کا کام کرتا ہے تو ان اطلاعات کا خالص پن کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ نفس انسانی ان میں اپنی مصلحتوں اور اغراض کے تحت جس قدر تبدیلی پیدا کرتا ہے یہ اسی قدر آلودہ ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح جب ہم 'سَمْعِهِمْ' اور 'اَبْصَارِهِمْ' کے الفاظ پہ غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مادی کانوں یا مادی آنکھوں کی بجائے قوت سماعت اور بصارت کی بات کی جارہی ہے۔ اس سے بھی اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اگر انسان کے اندر اطلاعات موصول کرنے والی ایجنسی یعنی قلب ٹیڑھا ہو جائے تو اس کی سماعت کے راستے اُس کو ملنے والی اطلاعات بھی ٹیڑھی ہو کر ملتی ہیں اور بصارت پہ پردے پڑنے کا تو یہی اک مفہوم بنتا ہے کہ اُس کی بصیرت کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور انسان گمراہی میں اتنی دور نکل جاتا ہے جہاں سے اُس کی واپسی کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ اللہ معاف کرے۔ اس سے بڑھ کر تیرہ بختی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس آیت کو پڑھ کر یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی حفظ و امان میں رکھے اور ہمیں تو فیق دے کہ ہم اپنے اندر سے آنے والی، اپنے ضمیر کی آواز کو سن سکیں..... اور سن لینے کے بعد اس کو کبھی نظر انداز نہ کریں۔ آمین

Scanned by CamScanner

جبر و قدر

تقدیر کیا ہے؟ انسان کس حد تک بااختیار ہے؟ کیا انسان مجبورِ محض ہے؟ کیا انسان کلی طور پر بااختیار ہے؟ ہر غور و فکر کرنے والے انسان کو کسی نہ کسی سٹیج پر ان باتوں کا خیال ضرور آتا۔ جب وہ خود کو مجبورِ محض سمجھ لیتا ہے تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ اب جو بھی کروانا ہے، مجھ سے اللہ ہی کروائے گا تو میں کچھ کروں گا۔ اسی طرح جب زندگی کے مختلف مراحل میں خود کو بااختیار سمجھتا ہے لیکن عملی طور پر خود کو کسی اختیار کا حامل نہیں پاتا تو وہ الجھ کر رہ جاتا ہے۔

فلسفۂ جبر و قدر پر جتنے نظریات پیش کیے گئے ہیں، اُن کو ہم تین اقسام میں بانٹ سکتے ہیں۔ پہلی قسم کے نظریات کے مطابق انسان کو کلی طور پر بااختیار پیدا کیا گیا ہے اور اُس کو عقل و فرزانگی سے نواز کر اس کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ جو جی چاہے کرے اور جیسے جی میں آئے کرے۔ عقل پرست اور دنیا دار لوگ جو مادی زندگی کو ہی سب کچھ تسلیم کرتے ہیں، وہ انسان کو کلیتاً بااختیار مانتے ہیں۔ دوسری قسم کے نظریات کے مطابق انسان کو کسی قسم کا

Scanned by CamScanner

کوئی اختیار نہیں دیا گیا اور وہ مجبورِ محض ہے۔ صوفیا کرام اور اُن کے راہبانیت پسند پیروکاروں کے مطابق انسان مجبورِ محض ہے۔ اُن کے مطابق کارخانہ قدرت میں اُن کا کردار خالق کی بنائی ہوئی ایک بے جان تصویر سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ خالقِ ارض وسماء نے اُن کو صرف اپنی ثنائی کی داد لینے اور اپنی بے پایاں قدرت کے اظہار کے لئے تخلیق کیا ہے۔

تیسری قسم کے افکار و نظریات وہ ہیں جن کے مطابق انسان نہ تو کلیتاً بااختیار ہے اور نہ ہی مجبورِ محض.... وہ کسی حد تک مجبور ہے اور کسی حد تک بااختیار۔ ان کے مطابق انسان کو اللہ نے اس لئے تخلیق کیا ہے کہ انسان اللہ کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کی جانب سے تفویض کردہ کام کرے۔ اب اُس کے اختیار کی حدود کیا ہیں اور اُس کی مجبوری کا دائرہ کہاں تک پھیلا ہوا ہے، اس کی بابت، جتنے منہ اتنی باتیں، کے مصداق کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ اس قسم کے نظریات کا سرخیل نظریہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے منسوب یہ واقعہ ہے۔ ایک بار کسی نے اُن سے دریافت کیا کہ انسان بااختیار ہے یا مجبور..... تو انہوں نے دریافت کرنے والے سے کہا۔ کھڑے ہو کر ایک پاؤں اٹھاؤ۔ اس نے ویسا ہی کیا۔ پھر آپ نے فرمایا۔ اب دونوں پاؤں اٹھاؤ۔ اس نے کہا یہ تو ممکن نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا، اسی طرح انسان بھی ایک حد تک آزاد اور خود مختار ہے اور ایک حد کے بعد وہ مجبور ہے۔

ان باتوں پر غور و فکر کے نتیجے میں پہلی بات تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ بات طے ہونے کے بعد کہ انسان کسی حد تک آزاد اور کسی حد تک مجبور ہے، یہ طے کرنا باقی ہی رہا کہ انسان کے کون کون سے اعمال و افکار ایسے ہیں جن کی بابت انسان بالکل آزاد و خود مختار ہے اور وہ کون کون سی باتیں ہیں جن کے بارے میں ہم اُس کو مجبور و پابند قرار دے سکتے ہیں۔ اس بات کی کوئی صراحت کہیں نہیں ملتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس کام کو ایک انسان اپنی مجبوری بتاتا ہے دوسرے کے نزدیک انسان اسی کام میں آزاد ہے۔

ان باتوں کو ایک دفعہ اپنے ذہن میں حل اور طے کر لینے کے بعد انسان بہت سی

Scanned by CamScanner

دشواریوں اور پیچیدگیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ حضور قلندر بابا اولیاؒ کے مطابق انسان کو صرف نیت کا اختیار دیا گیا ہے اور اسی بات پہ اجر و جزاء، انعام اور سزا کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ اِنَّمَا الاَعْمَالُ بِالنِّیَّتْ کا اصل مفہوم یہی بنتا ہے کہ انسان کے جملہ اعمال اسی وقت ممکن ہوتے ہیں جب وہ کسی عمل کی نیت کر لیتا ہے۔ اگر اس نے کسی کام کی نیت ہی نہیں کیا اور وہ اس سے سرزد ہو جائے تو ایسے اعمال تعزیری قوانین کی زد میں بھی نہیں آتے۔ جب انسان کسی کام کی نیت اور ارادہ کر لیتا ہے تو قدرت اس کے مطابق اس کو وسائل فراہم کر دیتی ہے۔ یہ نیت اور ارادہ ہی انسان کے اعمال کی اساس اور بنیاد بنتے ہیں۔

انسان کو سب سے زیادہ دشواری تقدیر کے تصور کے واضح نہ ہونے کے سبب ہوتی ہے۔ جب وہ تقدیر کو اپنے سرزد ہونے والے اعمال کا پہلے سے طے ہونا مان لیتا ہے تو مسئلہ یہ ابھرتا ہے کہ پھر جہنم کی نوید کیوں اور انبیا کا انسان کی اصلاح کے پروگرام کا کیا مقام ہوا؟ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے ارادہ ترک و اختیار کو کیسے سمجھا جائے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں پہلے تقدیر اور پھر انسان کے ارادہ کو قرآن سے مدد لے کر سمجھ لینا چاہیے۔

قرآن حکیم میں لفظ 'قدر' اور اس کے مشتقات کا ۱۳۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے ان میں تقدیر کا لفظ تین بار استعمال کیا گیا ہے۔ ان تمام مقامات پہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا مفہوم مقداروں کے مقرر ہونے اور ان کا پہلے سے طے کر دیا جانا ہے۔ چاند، سورج، زمین و آسمان، بارش کے برسنے سے لے کر ہر چیز کی مقداروں کا متعین اور مقرر کیا جانا تقدیر الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ آیت **و الشمس تجری لمستقر لھا ذالک تقدیر العزیز العلیم** میں سورج کے اپنے راستے پر وقت کی پابندی کے ساتھ چلنے کو صاحب علم و قوت کی طرف سے طے کیا جانا بتایا جا رہا ہے۔

کسی بھی نوع کے افراد کو دوسری انواع سے ممتاز اور ممیز کرنے کے لئے مقداروں کا تعین ہونا ایک بات ہے اور کسی فرد کے اعمال و افعال کا تعین ہونا ایک الگ بات ہے۔ ایک

Scanned by CamScanner

بکری سے کبھی بھیڑ، بھیڑ سے کبھی کسی بکرے نے جنم نہیں لیا اور نہ لے سکتے ہیں۔ اسی طرح آم کے درخت پر کبھی سیب اور سیب کے درخت پر کبھی بیر نہیں لگتے۔ سائنسدان جانداروں میں اس بات کو جینز (Genes) سے، اور جمادات میں ایٹموں کی تعداد کے مقرر و متعین ہونے سے منسوب کرتے ہیں۔ قرآن انسان کو اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ انسان ہو یا حیوانات و نباتات اور جمادات، ان سب کی تخلیق میں مقداروں کا تقرر اور تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا گیا ہے۔

اعمال و افعال کے سرزد ہونے کے نظام میں جنات اور انسان کی سطح پر جن و انس کا ارادہ، ترک و اختیار بھی اپنا ایک کردار رکھتا ہے۔ اس بات کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اختیار کا اصل مفہوم کیا بنتا ہے۔ ہم عموماً اختیار کو قوتِ اقتدار کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے انسان کا بطور خلیفۃ الارض تقرر اور اس ضمن میں اس کو اختیارات کے عطا کئے جانے کی بات کا عام طور پر یہی مفہوم لیا جاتا ہے کہ انسان مادر پدر آزاد ہو کر جو جی چاہے کرتا پھرے کوئی اس کو پوچھنے والا نہیں ہے.... حالانکہ اس کا اصل مفہوم اللہ کی طرف سے انسان کو کچھ فرائض تفویض کیا جانا اور انسان کا ان کو اپنانا اور اختیار کرنا بنتا ہے۔ جب انسان نے کچھ باتوں کو اپنے فرائض مان کر اختیار تو کر لیا لیکن اُن کو پورا کرنا تو کجا اُن کو پوری طرح سمجھنے پر ہی آمادہ نہ ہونا، اس کے ظلم اور جہالت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے بنک منیجر کی مثال پہ غور کیا جائے۔ کسی بھی بنک کا مالک سیٹھ جس کسی کو اپنا منیجر مقرر کرتا ہے، اس کو بعض مراعات دیتا ہے اور کچھ فرائض سونپتا ہے۔ اُن فرائض کی بجا آوری کے لئے منیجر کو جن اختیارات کی ضرورت پڑتی ہے وہ ایک پاور آف اٹارنی (Power of Attorney) کے تحت اُس کو دے دیئے جاتے ہیں۔ اب کوئی بھی بنک منیجر اُن اختیارات کو غلط طریقے یا غلط انداز میں استعمال نہیں کرتا اور نہ ہی اس کا یہ مطلب لیتا ہے کہ اب وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے، جس کو چاہے اور جتنا چاہے بنک کی رقوم

Scanned by CamScanner

میں سے ادا کرسکتا ہے۔ وہ ایک نظام کے تحت، ان اختیارات کو ایک امانت کی طرح، سوچ سمجھ کر استعمال کرتا ہے۔ اُن تفویض کردہ اختیارات کو اپنے فرائضِ منصبی کی بجاآوری کے علاوہ استعمال کرنے کا سوچنا جرم سمجھتا ہے۔ اس بارے میں اس کو کبھی کوئی اشتباہ نہیں ہوتا لیکن جب انسان کو اللہ کی طرف سے اختیار دیئے جانے کی بات ہوتی ہے تو اس کی بابت انسان کے ذہن میں مغالطے جنم لیتے ہیں اور اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ جتنی محنت ایک بنک منیجر نوکری کرنے اور اس کو بچانے کے لئے کرتا ہے، ہم اللہ کی خاطر اتنی بھی محنت کرنے پہ آمادہ نہیں ہو پاتے۔

جب یہ بات ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ انسان کو کسی قسم کا کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے بلکہ خالقِ کائنات ہی تمام اختیارات کا منبع اور ماخذ ہے۔ اس کائنات اور ہمارا آقا، رب اور مالک وہی ہے، تو انسان جان لیتا ہے کہ انسان کے ذمے کچھ فرائض لگائے گئے ہیں۔ ان فرائض کی بجاآوری کے لئے سب سے پہلے تو اُن فرائض کا مکمل ادراک اور شعور حاصل کرنا اس پہ لازم آتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کردہ صلاحیتوں کو، اُن فرائض کی بجاآوری کے لئے، درست انداز اور صحیح طریقے سے، برتنے کی شرط بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

اس انداز سے دیکھنے پر یہ بات سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ انسان کو اپنے پیدا ہونے، جائے پیدائش اور وقت پیدائش، یا اپنی جنس کے تعین یعنی وہ مرد ہوگا یا عورت اور کب تک اس کو زندہ رہنا ہے اور اس کو کیا فرائض سرانجام دینا ہیں.....ان سب باتوں کی بابت کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ پیدا ہونے کے بعد اس نے زندگی کو، فراہم کردہ حالات میں، کیسے اور کیوں کر بسر کیا، اس بات میں وہ مختلف اوقات میں نیت کرنے، اس کو پورا کرنے یا نہ کرنے کی بابت آزاد و خود مختار ہے۔ کسی کام کو کر لینے کی نیت کرنے کے بعد اس کام کو سرانجام دینے کے لئے اس کو جو وسائل درکار ہوتے ہیں، وہ سب وسائل اُس کو اُن وسائل کا مالک اور خالق اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔ جب انسان اُن وسائل کو اللہ کی عطا سمجھ کر،

Scanned by CamScanner

اللہ کے نظام میں اپنے لئے تعین کردہ فرائض کی روشنی میں استعمال کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو اجرِ کریم کی بشارت دیتا ہے۔ لیکن جب انسان ان وسائل کو اپنی محنت کا حاصل اور اپنی قوتِ کار کا مآل جان کر اُن کو سینت سینت کر رکھتا اور جمع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند کرتا ہے اور اُس کو عذاب الیم کی وعید سناتا ہے۔

انسان کے ذہن میں موصولہ اطلاعات ایک نظام کے تحت مختلف مراحل سے گذر کر انسانی ذہن پر ایک دباؤ پیدا کرتی ہیں اس دباؤ کے زیر اثر انسان کسی ایک سمت کا تعین کرتا ہے اور اس سمت میں گامزن ہو جاتا۔ اس عمل کو انسان نیت کرنا کہتا ہے۔ جب انسان کسی چیز یا کسی بات کی نیت کر لیتا ہے تو اس نیت میں تکرار اس کو ارادہ بنا دیتی ہے۔ انسان کو کسی ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو قوت درکار ہوتی ہے وہ اس کو قوتِ ارادی کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ قوتِ ارادی سے کام لینا یا نہ لینا بھی انسان کی اپنی نیت پر منحصر ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی نیت یہ کر لیتا ہے کہ اُس نے قوتِ ارادی سے کام نہیں لینا تو وہ ارادہ ترک ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر انسان اپنی قوتِ ارادی سے کام لینے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اس ارادے کو پورا کرنے کے وسائل بہم پہنچا دیتے ہیں۔ سورہ یاسین کی آخری آیت انما امرہ اذا ارادہ شیاءً ان یقول لہٗ کن فیکون میں اللہ تعالیٰ اسی بات کی وضاحت فرماتا ہے۔ جب تک انسان اپنی قوتِ ارادی سے کام نہیں لیتا کوئی بھی عمل اس سے سرزد نہیں ہو سکتا۔

حالات پہ انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ انسان کو اچھے اور برے ہر دو قسم کے حالات سے گزارا ہی اس لئے جاتا ہے تا کہ وہ اپنے اندر مستور خوابیدہ صلاحیتوں کو استعمال کرے۔ جو لوگ حالات کے بہتر ہونے کا انتظار کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو استعمال نہ کرنے کے سبب کفران کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جب انسان، حالات کے دباؤ کو خاطر میں لائے بغیر، اپنے فرائض کی انجام دہی میں جتا رہتا ہے..... تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق اس کے حالات کو بہتر حالات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا کے ہر کامیاب انسان کی کامیابی کا اصل راز یہی ہے کہ بدترین حالات میں بھی انہوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور وہ اپنی دھن میں جتے رہے

Scanned by CamScanner

تھی کہ کامرانی اُن کے ہمرکاب ہوگئی۔ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ لوگ کرنے کے کاموں کو حالات کے بہتر ہونے تک اٹھا رکھتے ہیں۔ اس سے نہ تو حالات بہتر ہوتے ہیں اور نہ ہی کام مکمل ہو پاتے ہیں۔ جب کیے جانے والے کام کیے ہی نہ جائیں تو کیسی کامیابی اور کیسی کامرانی؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے لوگ تقدیر کو کوسنے بیٹھ جاتے ہیں اور بات کو نہ سمجھنے، اپنی صلاحیتوں کا استعمال نہ کرنے کی کوتاہی کا ازالہ نہیں ہو پاتا۔

حضور نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں اپنے مشن کے کام نہ صرف جاری رکھا بلکہ اُس کو مسلسل آگے بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اب اگر وہ حالات کی بہتری کا انتظار ہی کرتے رہتے تو آج شاید ہمارے پاس فخر کرنے کو وہ تاریخ بھی نہ ہوتی۔ جب مسلمانوں نے آسودگی اور خوشحالی دیکھ لی اور دستیاب وسائل کو اس طرح سے استعمال کرنا ترک کر دیا جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کے ذریعے ان کو تعلیم کیا تھا تو وہ عزلت اور پستی میں گرتے چلے گئے۔ جو کامیابی جس قدر نامساعد حالات میں حاصل کی جاتی ہے وہ اسی قدر بڑی اور عظیم کہلاتی ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاؒ کا ارشاد ہے کہ انسان حالات کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔ حالات اُس میں جس قسم کی چابی بھر دیتے ہیں وہ اُسی کے مطابق اور اسی مناسبت سے عمل کرتا ہے۔ اس بات کا بھرپور ادراک حاصل ہونا چاہیے کہ ایک ہی قسم کے حالات میں دو مختلف افراد دو مختلف انداز میں کیوں عمل کرتے ہیں؟ ایک ہی قسم کے حالات میں ہر فرد ایک ہی جیسا ردِ عمل کیوں نہیں کرتا۔ ایک طرح کے حالات کو ایک فرد ایک طرح سے لیتا ہے جبکہ اسی طرح کے حالات کو کوئی دوسرا فرد بالکل کسی اور طرح سے لیتا ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ لوگ تنہائی کا شکار ہو کر بیمار پڑ جاتے ہیں جبکہ بعض افراد تنہائی میں بیٹھ کر غور و فکر کرتے ہیں اور عمل کی نئی راہیں کھوج نکالتے ہیں۔ ایک عام انسان کے نزدیک تنہائی ایک سزا سے کم نہیں جبکہ حضور نبی کریم ﷺ نے غارِ حرا میں جا کر

Scanned by CamScanner

تنہائی کا شکار کیا۔ اُس خود اختیار کردہ تنہائی میں انہوں نے سوچ بچار سے اس قدر کام لیا کہ اُن کی پرواز فکر نے لامحدودیت کو چھولیا اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو وہ نسخہ کیمیا عطا فرمایا جس کے ماننے والوں کی تعداد آج ایک ارب افراد سے بڑھ چکی ہے۔ ماننے والوں کی اس تعداد کا عشر عشیر بھی اگر اس نسخہ کیمیا کو غیر جانبداری سے سمجھ لے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان کسی بھی دوسری قوم سے کمتر رہ جائیں۔

کامیاب ہونے یا کامیاب نہ ہونے کا تعلق نیت سے ہے۔ انسان اپنے لئے کیا راہ چنتا ہے اور اس راہ پہ کس قدر استقامت سے گامزن رہتا ہے۔ اس بات کو یقین کی قوت سہارا نہ دے اور بے یقینی کی دھندراہ میں حائل ہو جائے تو بنی بنائی نیت ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے۔ اس بے یقینی کی کیفیت کو قرآن حکیم شک کہتا ہے۔ جب انسان شک کا شکار ہو جاتا ہے تو اُس کے یقین کی قوت ٹوٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ اسی لئے تمام انبیا کی تعلیمات میں یقین کو بہت اہمیت دی گئی ہے کیونکہ یقین کی کمی سے انسان وسوسوں اور بے یقینی کا شکار ہو جاتا ہے۔

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہٗ العالی نے اپنی کتاب 'روحانی علاج' میں اس بات کو شرح وبسط کے ساتھ واضح فرمایا ہے کہ کس طرح سے یقین کی قوت انسانی دماغ میں موجود کھربوں خلیات کو توانائی دیتی اور بے یقینی کی قوت ان کو کس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار کر دیتی ہے۔ عظیمی صاحب فرماتے ہیں کہ شک، بے یقینی اور وہم سے پیدا ہونے امراض کی تعداد سینکڑوں سے تجاوز کرتی ہے اور اُن سب کا علاج یقین کی اُس قوت سے ہے جو ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے ودیعت کی ہوئی ہے۔

انسان کو حالات پہ اختیار نہ سہی لیکن اُس کو اس بات پہ بہرحال اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے اندر یقین کو ابھارے اور بے یقینی، شک اور وسوسوں سے نجات پالے۔ قرآن حکیم انسان کو اپنے اندر یقین کی قوت کو بڑھانے اور بے یقینی اور شک سے منع کرتا ہے۔ اس سے انسان کے اندر موجود روشنیوں کے ذخیرے ضائع ہوتے ہیں۔ انسان کی قوت کار اور پرواز فکر کے لئے درکار انرجی ضائع ہوتی ہے۔

Scanned by CamScanner

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ

قرآنِ پاک کو نہ سمجھنا ایک بات ہے لیکن اس کی آیات کے وہ مطالب و مفاہیم متعین ہونا جو قرآن کی اصل روح سے متصادم ہی نہیں بلکہ بعض اوقات تو بالکل ہی الٹ ہوں تو اس بات کو ہم اپنی تیرہ بختی کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ آج دنیا میں من حیث الامت مسلمہ ہمارا جو مقام ہے وہ ہمارے اپنے اعمال ہی کے سبب ہے.... اور اعمال کا تعلق کسی فرد یا جماعت کے اُن تصورات اور نظریات سے ہوتا ہے جن کو وہ درست مان کر اپنا لیتے ہیں۔ اگر وہ تصورات اور نظریات مبنی بر حقیقت نہ ہوں تو اعمال اور افعال کے نتائج کسی طور پر مفید یا سودمند نہیں ہو سکتے۔

اس کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم میں سے ہر فرد قرآنِ حکیم کو اس طرح سے خود سمجھے جس طرح اُس کو سمجھنے کا حق ہے اور دوسروں کو بھی اس بات کی ترغیب دے کہ وہ اس کو درست انداز میں صحیح مفاہیم کے ساتھ سمجھیں۔ جب مسلمانوں میں کلام پاک کے درست مطالب اور مفاہیم سے مطابقت رکھنے والے تصورات اور نظریات عام ہوں گے تو نہ صرف

Scanned by CamScanner

اوہام، غلط عقائد اور توہم پرستی کی جڑ کٹے گی بلکہ ہمارے اعمال و افعال بھی قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ ہوتے چلے جائیں گے۔

کلام الٰہی سے وابستہ غلط مفاہیم کی تصحیح کا اصل طریقہ یہی بنتا ہے کہ قرآنی موضوعات پہ، قرآن پاک کی روشنی میں، تفہیم کے حوالے سے عوام میں شعور بیدار کیا جائے۔ اب تک خواص نے اس سلسلے میں جو خدمات سرانجام دی ہیں ان کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ عام آدمی قرآن کے حوالے سے اپنے ذہن میں موجود گرہوں کو کھولے۔ قرآن کے الفاظ اور آیات پہ گہرائی میں اتر کر غور کیا جائے گا تو ذہنوں میں پھیلی دھند خود بخود تحلیل ہوتی چلی جائے گی اور انسان اس کے انوار کی ضیا پاشیوں سے زیادہ بہتر انداز میں مستفیض ہو سکے گا۔

قرآن پہ غور و فکر کے لئے اس بات کا ذہن نشین ہونا ضروری ہے کہ الفاظِ قرآنی کے ذریعے اللہ تعالیٰ حکیم و خبیر ہمارے ذہنوں کو کسی ایسے مفہوم کی طرف متوجہ کرتا ہے جن کو اپنے ذہن میں راسخ کر لینے سے ہماری طرز فکر اس سانچے میں ڈھل جاتی ہے جس کے نتیجے میں ہمارے اعمال و افعال اللہ کی مرضی، قوانین الٰہیہ اور فطرت کے عین مطابق ہو جاتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ کا وہ مفہوم لینا جو اُن الفاظ کے حوالے سے اردو میں رائج ہے کسی حد تک تو درست ہو سکتا ہے کیونکہ اردو میں پچاس فیصد سے زائد الفاظ عربی ہی سے لئے گئے ہیں۔ لیکن اس بات کو بھی نظر میں رہنا چاہیئے کہ جب کوئی لفظ کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو اس لفظ سے متعلق تصورات میں خاصی تبدیلی آ جاتی ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک الگ مزاج اور چلن ہوتا ہے۔ اس لئے جب کوئی لفظ اپنی اصل زبان میں استعمال ہوتا ہے تو لغوی معنوں کے ساتھ ساتھ وہ کچھ مزید مفاہیم کا بھی حامل ہوتا ہے۔ جب وہی لفظ کسی دوسری زبان میں استعمال ہونا شروع ہو جاتا ہے تو اُس میں اُس زبان کے مزاج اور اطوار بھی جھلکنا شروع ہو جاتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

بے تکلف بول چال میں ہم اکثر دوستوں سے پوچھتے ہیں، چائے چلے گی؟ کھانا ہو جائے؟ تاش کا موڈ ہے؟ اس بات کی تشریح کے بغیر ہی ہم جان لیتے ہیں کہ چائے کا چلنا، کھانے کا ہونا اور کھیل کا موڈ ہونا کسی بھی طور ان الفاظ کے لغوی مطالب تک محدود نہیں۔ اسی طرح اردو میں اکثر کہا جاتا ہے کہ صبر کرو۔ بے صبری مت کرو۔ اردو میں غم والم کی کیفیت کو سہنے اور تکلیف برداشت کرنے کے علاوہ اس لفظ کو جلد بازی کے متضاد کے طور پر بھی برتا جاتا ہے۔ اسی طرح سب جانتے ہیں .... تیرا شکر ہے یا.... شکر ہے یہ کام ختم ہوا! کا مفہوم کیا ہے۔ انگریزی تہذیب کے زیر اثر ہمارے یہاں شکریہ... تھینک یو کے مترادف کے طور استعمال ہوتا ہے۔

اسلام کی بابت ہم کہنے کو تو یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک مکمل دین ہے۔ ہم اس کو دین فطرت بھی کہتے ہیں لیکن جب بات ہمارے عملی سلوک کی آتی ہے تو یہ دیکھ کر ناطقہ سر بہ گریبان ہو جاتا ہے کہ ہم اس کی مبادیات سے بھی لاعلم ہیں۔ جب آپ کسی سسٹم کی الف بے تے ہی نہیں جانتے تو اس پہ عمل کیسا؟ اب یہ بات کون نہیں جانتا کہ صبر شکر بہت اچھی بات ہے۔ لیکن ہمارے ہاں ان دونوں کے اصل مفہوم کی بابت جس قدر لاعلمی پائی جاتی ہے اس کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کے اصل مفہوم سے آگاہی نصیب ہوتی ہے۔ چونکہ ان دونوں خصوصیات کا انسانی کردار سے ایک راست تعلق ہے اس لئے کردار کا غازی بننے کے متمنی لوگوں کے لئے ان الفاظ کے درست مفہوم سے آگاہ ہونا لازم ہو جاتا ہے۔

صبر کا مطلب عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تکلیف پڑنے پر یا کسی مصیبت کے وقت قوت برداشت کا مظاہرہ کیا جائے اور اُس کڑے وقت کو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے گزار دیا جائے۔ اگر یہ مفہوم مان لیا جائے تو اسلام کی تمام تر تعلیمات اپنی اصل روح سے دور جا پڑتی ہیں۔ صبر ایوب کی ڈھائی نے اس کا مفہوم واضح کرنے کی بجائے اس کا اصل لغوی مفہوم تک خبط کر دیا ہے۔ وہ لفظ جو حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنے، استقامت اور

Scanned by CamScanner

حوصلہ مندی کے اعلیٰ ترین درجات کی تعلیم دینے کو استعمال کیا گیا تھا ہم نے اس کو محدود ترین طرزوں میں قوت برداشت کا امتحان بنا کر دین فطرت کی پوری نیو کو ہی ٹیڑھا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

صبر اور شکر کے وہ مفاہیم جو ہماری زبان میں عام ہیں، ان الفاظ کے قرآنی مفہوم سے کس قدر مطابقت رکھتے ہیں؟ اس بات کو نہ سمجھنے کا یہ نتیجہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کسی طور بھی ہمارے دل میں اس طرح سے گھر نہیں کر رہی ہیں جس طرح سے اُن کو ہونا چاہیئے۔ کلام پاک میں لفظ صبر صرف دو مرتبہ لیکن اس کے مشتق الفاظ ۱۰۱ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ ان تمام مقامات پہ اگر نظر ڈالی جائے اور اس بات کا اندازہ لگایا جائے کہ وہ کیا بات ہے جو ان تمام جگہوں پر یکساں طور پر مراد ہو سکتی ہے۔ تو اس نتیجے پر پہنچنا کوئی زیادہ دشوار نہیں رہتا کہ قرآن پاک میں صبر کو تکلیف سہنے اور غم والم کو برداشت کرنے کی بجائے ثابت قدمی، استقامت، پامردی اور جہد مسلسل کے مطالب کی ادائیگی کے لئے برتا گیا ہے۔

ہمارے یہاں صبر ایوبؑ کہاوت اور محاورے کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور اس بارے میں کبھی کسی کے ذہن میں یہ خیال تک نہیں آتا کہ اس کا جو مفہوم ہم لیتے ہیں وہ قرآن کی اصل روح سے کوئی مطابقت رکھتا بھی ہے یا نہیں؟ حضرت ایوب، حضرت ادریس، حضرت اسماعیلؑ، حضرت ذوالکفلؑ کی بابت اللہ نام لے کر فرماتا ہے کہ یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے۔ اسی طرح اپنے تمام بھیجے ہوئے رسولوں کی بابت یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ وہ اولوالعزم رسول تھے۔ صبر کرنے والوں کی بابت عزم الامور کہا جانا تو اس بات میں کوئی اشتباہ باقی ہی نہیں رہنے دیتا کہ صبر کو محض ایک ہارے ہوئے انسان کی آخری پناہ سمجھنا درست رویہ نہیں ہو سکتا۔

واستعینوا بالصبر و الصلوۃ، ان اللہ مع الصابرین یعنی صبر اور صلوٰۃ کی استعانت لو کیونکہ اللہ تو ثابت قدمی، استقامت، پامردی سے کام لینے اور جہد مسلسل کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب اس بات پہ غور کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ منہ سر لپیٹ کر پڑ رہنے پر

Scanned by CamScanner

خوش ہوتا ہے یا مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی فرماتے ہیں: "جس انسان میں صبر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے۔" اس بات کا دوسرا پہلو یہ بنتا ہے کہ جو انسان خوش رہنا سیکھ لیتا ہے، اس میں صبر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جس میں صبر پیدا ہو جائے، وہ اللہ کو اپنے ہمراہ محسوس کرنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔ ورنہ اللہ تو سب ہی کے ہمراہ ہے۔

خوشی کیا ہے؟ اس بات سمجھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خوشی کے دو بنیادی اجزاء صبر اور شکر ہیں۔ اس بات کو جب ہم اپنے اردگرد نظر دوڑا کر حقیقت حال کو جانچتے ہیں تو ہمیں خوش، مطمئن، پرمسرت اور سکون آشنا زندگی تلاش کرنے پر بھی کہیں نہیں ملتی۔ حالانکہ ہم سب ہی تکلیف کو بہرحال برداشت کرتے ہیں اور زبان سے یا اللہ تیرا شکر ہے، کہنے میں کم ہی کوتاہی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کم ہی چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر خوشی اور مسرت کی چھاپ ہمیں نظر آتی ہے۔

ہمارے یہاں تو خوشی کے مواقع پہ جو حشر دیکھنے میں آتا ہے وہ پنجابی کے نامور شاعر محمد عباس مرزا کے مطابق کچھ یوں ہے۔

خوشی جے آگئی اے تے کنج منا لیئے

ساڈے گھر تے ایہہ وی رونا پے جاندا اے

اب یہ ایک نہایت عجیب بات ہے کہ ہر انسان خوش، مطمئن، پرمسرت اور سکون آشنا زندگی گزارنے کی خواہش ہی نہیں رکھتا بلکہ دن بھر اسی تگ و دو میں مصروف بھی رہتا ہے کہ کسی طرح اس کو خوشی، مسرت اور چین کے کچھ لمحات میسر آ جائیں لیکن اس کے باوجود خوشی اور مسرت جیسی نعمت کا حصول دن بدن دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے اور وہ کون سی کمی ہے جو ہماری خوشیوں اور مسرتوں کے حصول کی خواہش کی تکمیل کے بیچ حائل ہو جاتی ہے۔ اس بات کی اہمیت کو سمجھنا بہت ہی ضروری ہے کہ

Scanned by CamScanner

کسی بات کا درست مفہوم جانے بغیر اس پر اچھی طرح عمل کرنا کس قدر دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر ہم قرآن حکیم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی سچ مچ کوئی خواہش رکھتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اس کی تعلیمات کو اس کی اصل روح کے مطابق سمجھنا ہوگا۔ جب تک اس کام کا آغاز نہیں ہو جاتا، اس وقت تک ہمارے نظریات، افکار، اعمال اور افعال کسی صورت قرآنی تعلیمات کے مطابق نہیں ہو سکتے۔

شکر کا حال صبر سے بھی زیادہ پتلا بنانے میں ہماری کم فہمی نے اپنا کردار بھرپور ادا کیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں لفظ 'شکر' اور اس کے مشتقات کی کل تعداد ۷۵ بنتی ہے۔ ان تمام مقامات کو نظر میں رکھتے ہوئے جب اس لفظ کے اُس مفہوم کی کھوج کی جاتی ہے جو اس کے اصل معنی سے قریب تر ہو تو ہم اس آیت پہ آ کر رک جاتے ہیں۔ ما تشکرون الا قلیلاً

اب ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ بات بات پہ کلمہ شکر ادا کرتے ہیں، کھانا کھا لیتے ہیں تو شکر الحمد للہ، کام ختم ہو جائے تو شکر الحمد للہ، کسی امتحان میں کامیاب ہو جائیں تو شکر الحمد للہ، کوئی اچھی خبر مل جائے تو شکر الحمد للہ.... لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم شکر نہیں ادا کرتے سوائے معدودے چند افراد کے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ 'ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تا کہ وہ شکر ادا کرے'۔ یہی بات حضرت سلیمانؑ کی بابت ارشاد ربانی میں ملتی ہے کہ 'ہم نے اُسے حکم اور علم عطا کیا اور وہ شکر بجا لائے' ان دونوں باتوں سے اگر یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ وہ دونوں کسی کونے میں بیٹھ کر منہ سے 'یا اللہ تیرا شکر ہے' کا کلمہ جپتے رہے تو عقلِ سلیم اس بات کو ماننے میں متامل ہی ہوگی۔ ان آیات پہ تفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا اصل مفہوم اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو عملی طور بھرپور استعمال میں لانا ہی ہو سکتا ہے۔ حضرت لقمان اگر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی حکمت کو استعمال کر کے بیماروں کو شفایاب کرنے کی بجائے گھر میں بیٹھ کر منہ سے کلماتِ شکر ادا کرنے میں لگ جاتے تو کیا اللہ کی عطا کردہ حکمت کا شکر ادا ہو جاتا؟

Scanned by CamScanner

اسی طرح اگر سلیمانؑ اور داودؑ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم اور اختیار کو عملی طور پر استعمال کرنے کی بجائے، جنگل میں کسی کٹیا میں بیٹھ کر، شکر الحمدللہ کا ورد کرنے لگ جاتے تو شاید اللہ تعالیٰ اُن کا تذکرہ اس انداز میں نہ کرتا۔ ہم نے ان کو علم اور حکمت عطا کی اور وہ شکر ادا کرتے تھے۔ یہاں اس بات کو نہایت توجہ سے سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ یہ ارشاد نہیں فرما رہا کہ ہم نے اُن کو علم و حکمت عطا کی تا کہ وہ شکر کریں۔ اللہ فرماتا ہے۔ 'اور انہوں نے شکر ادا کیا۔' اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

اس سے جہاں اور بہت سی باتوں کا پتہ ملتا ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم اور حکمت کا عطا ہونا اللہ کی طرف سے اللہ کی صوابدید کے مطابق ہوتا ہے اور شکر کرنا یعنی اُس علم اور حکمت کو درست، صحیح اور مناسب انداز میں استعمال کرنا انسان کے فرائض میں داخل ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی کسی عطا اور بخشی ہوئی صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا تو وہ کفران یعنی اللہ کی عطا کا عملاً انکار کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ وہ کفران کرتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے۔ 'ما تشکرون الا قلیلاً'۔ اس بات کو اللہ سے بہتر اور کون جانتا ہے کہ انسان اس کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں میں سے کس قدر قلیل حصہ (مقدار اور تعداد دونوں لحاظ سے) استعمال کرتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنی کتاب... 'مطالعہ قرآن، بیسویں صدی میں'.. میں رقمطراز ہیں۔

''قرآن فہمی میں ایک بڑا مانع، ہم اردو دانوں کے لئے یہ آ پڑا ہے کہ جو الفاظ عربی اور اردو میں مشترک ہیں، انہیں قرآن میں بھی، اُن کے اردو ہی مفہوم میں سمجھ لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں تو بیشک اشتراک لفظی کے ساتھ معنوی بھی ہے لیکن کثرت سے یہ ہے کہ لفظ اصلاً آیا تو اردو میں عربی ہی سے، لیکن اپنا مفہوم پورے کا پورا اپنے ساتھ نہ لایا۔ کہیں کچھ تھوڑا سا مفہوم لے کر آیا اور باقی وہیں چھوڑ آیا اور کہیں ایسا ہوا کہ یہاں آ کر پھیل گیا اور وہ مطالب

Scanned by CamScanner

اپنے اندر پیدا کر لئے جو عربی داں کے خیال میں بھی نہ آئے اور کہیں تنگی اور وسعت دونوں سے الگ ایک نیا ہی مفہوم پیدا ہو گیا۔ لفظ 'وسیلہ' اور لفظ 'جہاد' بھی ایسے ہی ہیں، جن کا اردو مفہوم ان کے عربی مفہوم سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس کی مثال سورہ المائدہ کی آیت ۳۵ میں مل جاتی ہے۔

یا ایھا الذین امنو اتقوا اللہ و ابتغو الیہ الوسیلۃ و جاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون

(اے ایمان والو! تقوی اختیار کرو اللہ کے لئے، اور ڈھونڈو راہ اس تک پہنچنے کی اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو تا کہ تم ہر طرح سے فلاح پاؤ)

عربی میں وسیلہ کے معنی قرب یا نزدیکی کے ہیں۔ ابن جریر طبری، قرطبی، ابن قتیبہ سب نے یہی معنی لئے ہیں۔ یہی معنی متعدد تابعین، مجاہد، حسن، قتادہ، عطار وغیرہ سے نقل ہوئے ہیں اور قرب حق کا بہترین وسیلہ احکام الٰہی کی تعمیل ہے۔"

آگے جا کر آپ مزید لکھتے ہیں۔

"ہمارے ہاں لوگوں نے عربی کے وسیلہ بمعنی قُرب کو اردو کے وسیلہ بمعنی ذریعہ کا مرادف سمجھ لیا ہے۔ ایسی شدید و فاحش غلطیوں کی مثالیں شاذ نہیں کثیر الوقوع ہیں۔ 'وسیلہ' کی طرح لفظ 'جہاد' کو بھی لوگوں نے اردو کے جہاد کے معنی میں لے رکھا ہے۔ اردو میں جہاد ایک دینی اصطلاح کی حیثیت سے قتال فی سبیل اللہ کے معنی رکھتا ہے۔ عربی میں یہ حصر و قید کچھ بھی نہیں۔ عربی میں جہاد کا مفہوم بہت وسیع و عام ہے۔ ہر سخت کوشش، جو کسی بھی دینی غرض سے کی جائے خصوصاً دشمنانِ دین کے مقابلہ میں، جہاد ہی کا درجہ رکھتی ہے۔ اور جہاد جس طرح میدان رزم میں تیر و تفنگ سے ہو سکتا ہے، اسی طرح بزم میں مال و دولت سے اور زبان و قلم سے بھی ہو سکتا ہے۔"

اس اقتباس سے محض یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہر عالم و فاضل دینی راہنما اس بات کو

Scanned by CamScanner

سمجھتا ہے کہ قرآن فہمی میں رکاوٹیں حائل ہیں۔ وہ اس بات کے کسی ایک یا چند ایک پہلوؤں کی طرف اشارہ کناں ہو کر رہ جاتے ہیں، لیکن اس رکاوٹ کو عبور کرنے کا کوئی قابل عمل طریقہ بتانے سے قاصر ہی رہے۔ ان رکاٹوں میں سے سب سے بڑی رکاوٹ تو ہماری وہ طرزِ فکر ہے جس کے تحت ہم قرآن فہمی کے لئے اتنی سی جدوجہد و سعی کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہو پاتے جتنی ہم دنیاداری کا کوئی بھی کام سیکھنے کے لئے کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ رغبت اور دلچسپی، توجہ اور یکسوئی، جس سے کام لیتے ہوئے ہم دنیاوی علوم سیکھتے اور خود کو اُن سے آراستہ کرتے ہیں، اس کا عشرِ عشیر بھی قرآن فہمی یا مطالعہ قرآن کے لئے وقف نہیں کرتے ہیں اور بے دریغ قرآن کو مشکل اور اس کی تفہیم کو ناممکن بتانے بیٹھ جاتے ہیں۔

اگر کسی قدر توجہ اور دلجمعی سے دیکھا جائے تو یہ امر واضح ہونے میں دیر نہیں لگ سکتی کہ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی نے صبر کو خوشی سے کیوں اور کیسے متعلق جانا۔ جو لوگ اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو بھرپور استعمال کرتے ہوئے قربِ الٰہی کے لئے کوشاں رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنی معیت اور ساتھ ہونے کی نوید دیتا ہے۔ جس فرد کے ذہن میں اس بات کا احساس اجاگر ہو جاتا ہے کہ اللہ اُس کے ساتھ ہے، وہ کیسے خوش نہیں ہوگا؟ اصل خوشی ہی اُس کی ہے۔

قرآنِ حکیم کی درست تفہیم سے اگر کہیں کوئی نوکری نہ بھی ملتی ہو تو ایک خوشی اور طمانیت کی ضمانت ضرور دی جا سکتی ہے۔ کسی بات کی صحیح تفہیم سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے، اُس بات پہ عمل پیرا ہونے سے، اُس خوشی میں مزید اضافہ ہی ہوگا، کمی کی کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی سوائے اس کے کہ انسان کے عمل میں کہیں کوئی کمی رہ جائے یا اُس سے اس ذیل میں کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے۔

Scanned by CamScanner

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ

قرآن حکیم کی ہر سورت کا نام اس سورت کے معنی یا اس میں استعمال ہونے والے کسی لفظ، شخصیت یا واقعہ سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہ جملہ قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے ایک سو بارہ کے لئے بالکل درست ہے۔ لیکن سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص کے نام رکھنے میں اس قاعدے کے برعکس ان سورتوں کے باطنی مفاہیم کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں ہی سورتوں میں نہ تو فاتحہ اور اخلاص کے الفاظ نظر آتے ہیں اور نہ ہی کوئی اور ایسا قرینہ معلوم ہوتا ہے جس سے بادی النظر میں ان کے یہ نام رکھے جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہو۔ سورہ الفاتحہ کو فاتحہ کہنے کی حکمت یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ سورہ قرآن کا آغاز کرتی ہے یا بالفاظِ دیگر قرآن کا ابتدائیہ ہے، اس لئے اس کو فاتحہ کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی افتتاح کرنے والی سورت۔

لیکن اگر لفظ فاتحہ پر غور کیا جائے اور ذہن کو اس طرف متوجہ رکھا جائے کہ اس نام کے رکھنے میں کیا حکمت ہو سکتی ہے؟ تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ یہ سورہ ان

Scanned by CamScanner

علوم کو کھولنے میں ممد و معاون ہے جن کو الوہی یا آسمانی علوم کہا جاتا ہے۔ اس کی سات آیات جس کثرت سے دہرائی جاتی ہیں ان کا اندازہ کرنے کو یہ تخمینہ کیا جا سکتا ہے۔ کتنے مسلمان اس سورت کو، دن میں کتنی بار نمازوں میں تلاوت کرتے ہیں۔ یہ تعداد لاکھوں نہیں بلکہ اربوں تک جا پہنچتی ہے۔ اس سورت میں سات آیات کا تعلق ست رنگی قوس قزح سے لے کر موسیقی کے سات سروں تک اور سات آسمانوں سے لے کر زندگی کے سات مراحل تک ہر اُس شے سے جوڑا جا سکتا ہے جن کی تعداد سات ہو، اور اُن میں قرآن کی سات منازل بھی شامل ہیں۔

اس سورت کو ام الکتاب بھی کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن میں مذکور تمام تر ذخیرہ علم و آگہی کو سات حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس سورت کی ساتوں آیات اس اس حصے کا سرنامہ بن سکتی ہیں جو ان آیات کے موضوعات ہیں۔ یعنی قرآن کے تمام موضوعات کو سات حصوں میں بانٹا جائے تو ہر حصے کا خلاصہ اس سورت کی ایک ایک آیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اب وہ سات موضوعات کیا ہیں جن کے عنوانات یہ سات آیات ہیں۔ یہ تمام باتیں گہرے تفکر اور عمیق سوچ بچار کی متقاضی ہیں۔

اسی طرح سورہ اخلاص کے نام کی وجہ جاننے کے لئے تجسس کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۃ کی پانچ آیات میں اللہ تعالیٰ کی پانچ ایسی صفات کو بیان کیا گیا ہے، جو مخلوق کو ودیعت نہیں کی گئی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی صفت ایسی نہیں جس کا تعلق اخلاص یا خلوص سے جوڑا جا سکے۔

بعض کے نزدیک اس کا نام خالصتاً اللہ تعالیٰ کی صفات کے بیان کے سبب اخلاص رکھا گیا ہے۔ یعنی اس میں بیان کی گئی تمام صفات اللہ ہی کے لئے خالص اور مخصوص ہیں اور مخلوق کو ان صفات سے کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا، اس لئے اس کا نام سورۃ اخلاص رکھا گیا ہے۔

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی احدیت، صمدیت، لم یلد ہونے، ولم یولد ہونے اور اپنا

Scanned by CamScanner

ثانی نہ رکھنے کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی تعریف (Definition) بیان کی گئی ہے۔ اس سورت کا ایک ایک لفظ دعوت غور و فکر دیتا ہے۔

مثلاً.... 'قل'... یعنی آپ کہہ دیجیے۔

جب حضرت جبرائیل امین نے حضور نبی کریم ﷺ سے کہا کہ آپ کہہ دیجیے تو... کس کو کہہ دیں؟... لوگوں کو بتا دیں۔ جب انہوں نے لوگوں کو بتا دیا اور اب جب ہم اس کی تلاوت کر رہے ہیں تو ان الفاظ کی ادائیگی ہم سے کیوں کروائی جا رہی ہے۔ ہم کس کو کہہ دیں؟ ہم کس سے مخاطب ہیں... جس کو بتانے کو ہم سے یہ 'قل' کہلوایا جا رہا ہے؟ آپ سوچ بچار کی مشقت سے بچنے کو کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں حضورؐ کے اتباع اور تقلید میں اس کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے اس لئے ہم 'قل' کہنے کے پابند ہیں۔ لیکن سوال تو یہی ہے کہ ہمیں قل کہنے کا پابند بنایا ہی کیوں جا رہا ہے؟ رہی بات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تقلید اور اتباع کی تو وہ تو ہم انہی کے ذریعے عطا ہونے والے قرآن پاک کی تلاوت کر کے کر ہی رہے ہیں۔ اس حکم کو ماننا ایسے ہی ہے گویا ہم نے اُن کی باقی باتوں کی تقلید تو کر ہی لی ہے، باقی کے تمام احکامات کی تعمیل ہو چکی ہے بس اب یہی ایک لفظ کہنا باقی رہ گیا تھا۔

اس طرح جب گہرائی میں غور کیا جاتا ہے اور انسان کے ذہن میں چھوٹی سے چھوٹی بات کی گرہ یا الجھن باقی نہیں رہتی تو ذہن انسانی بشاشت ہونے لگتا ہے۔ جب تک ذہن مطمعن نہ ہو جائے، دل میں اس بات کا کوئی شائبہ تک نہ رہے کہ جس جواب تک ذہن پہنچا ہے وہ حتمی نہیں ہے، غور و فکر جاری رہنا چاہیے۔

اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل سے فرمایا۔ 'قل'۔ یعنی آپ جا کر میرے محبوبؐ سے کہہ دیجیے۔

حضرت جبرائیل امین آ کر حضور نبی کریم ﷺ سے کہتے ہیں۔ 'قل'... یعنی آپ لوگوں سے فرما دیجیے۔

Scanned by CamScanner

اب حضور نبی کریم ﷺ نے لوگوں سے فرمایا۔ 'قل...' یعنی آپ کہہ دیں....

کس کو؟.... اس کی کوئی صراحت نہیں کی گئی۔ آگے مزید لوگوں کو، آنے والی نسلوں کو، ان لوگوں کو جو اُس وقت حضور نبی کریمؐ کے سامنے موجود نہیں تھے، جب انہوں نے اس سورۃ کی تلاوت فرمائی... یا اور کسی کو؟ یہ کوئی اور کون ہو سکتا ہے؟ کہیں وہ میں خود ہی تو نہیں ہوں جو اپنے من ہی من میں خود کو یہ بتا رہا ہے کہ وہ اللہ ہی تو ہے جو احدیت کا حامل ہے۔

اور پھر جب ہم اس بات پہ توجہ کرتے ہیں کہ نماز میں چپکے چپکے 'قل....' کہہ رہے ہیں تو اس وقت فرشتوں کے علاوہ ہم خود ہی تو خود کو سن رہے ہوتے ہیں۔ یعنی قرآن حکیم کی وہ تمام آیات جن کی ابتدا لفظ 'قل' سے ہوتی ہے وہ لوگوں کو تبلیغ کے ساتھ ساتھ، خود اپنے نفس کو بتائے جانے کی طرف ایک لطیف و بلیغ اشارہ بھی ہیں۔

اس بات کا ایک زاویہ یہ بھی بنتا ہے کہ جب کوئی فرد زبان سے 'قل...' کہتا ہے تو اس کے شعور میں یہ بات موجود ہوتی ہے کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کو کہے گئے الفاظ دہرا رہا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ذہن کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ خود کو نبی کی طرز فکر سے ہم آہنگ کرنے کو اُنؐ سے ربط کی اہمیت کو سمجھے۔ اس کو نبی کریمؐ کی نسبت حاصل ہو اور وہ خود ترغیبی کے عمل کو استعمال کرتے ہوئے اپنے افکار میں وہ بات شامل کر لے جو اس کی ذہنی نشوونما اور بالیدگی فکر کا سبب بن جائے۔

اب اس سورۃ میں ہم خود کو کیا باور کرواتے ہیں؟

ھو اللہ، ھو احد...

اللہ ہی تو ہے، جو احد ہے۔ اللہ ہی کے احد ہونے سے کیا مراد ہے؟ ایک ہونے کے لئے لفظ 'واحد' کیوں نہیں برتا گیا؟

جب ذہن کو ڈھیلا چھوڑ دیا جائے اور اس سوال کی اپنے اندر اس طرح سے تکرار ہونے دی جائے کہ یہ سوال اپنے اندر گونجتا ہوا محسوس ہو..... تو انسان کا ذہن بحرِ معنی میں

Scanned by CamScanner

غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ ایسے میں کان میں دھیرے سے سرگوشی سی ہوتی ہے۔ 'مرکز'.... یعنی اللہ ہی وہ مرکز ہے، جس سے.... فرد ہو یا پوری کائنات.... ایک دائرے کی مانند بندھے ہوئے ہیں۔ کائنات اور افراد کائنات میں اللہ تعالیٰ کی مرکزی حیثیت کا احساس ہونے کے بعد ہی اللہ کی احدیت کا احساس ذہن میں اجاگر ہونا شروع ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ خالق ہی کی صفت ہو سکتی ہے کیونکہ مخلوقات میں تو کوئی اس قابل ہو ہی نہیں سکتا کہ پوری کائنات کی ڈور اُسی سے بندھ جائے۔

اس کے بعد اگلی آیت پہ غور شروع ہوتا ہے اللہ الصمد.... وہ اللہ ہی تو ہے جو لاحتیاج ہے۔ کسی قسم کا کوئی تقاضا یا حاجت اس کو لاحق نہیں ہے۔ جب کہ مخلوق ہر قدم پہ کسی نہ کسی ضرورت، تقاضے اور حاجت کے حصار میں گھری رہتی ہے۔ جب ہم سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہم پوری طرح اپنے تمام تقاضوں کی تکمیل کر چکے ہیں اور اس وقت (وقتی طور پر ہی سہی) کوئی بھی حاجت ہمیں لاحق نہیں ہے تو اس وقت بھی ہم.... اور بہت کچھ تو چھوڑیں ایک طرف.... سانس تو لے ہی رہے ہیں.... آکسیجن کا استعمال تو کر ہی رہے ہیں۔

حضور قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں۔

'اللہ کی جو تعریف اس سورۃ میں بیان کی گئی ہے وہ خالق کی تعریف ہے، اور خالق کی جو بھی تعریف ہوگی مخلوق کی تعریف کے برعکس ہوگی۔ یا مخلوق کی جو بھی تعریف ہوگی، خالق کی تعریف کے برعکس ہوگی۔ اگر ہم خالق کی تعریفاتی حدوں کو چھوڑ کر مخلوق کی تعریف بیان کریں تو اس طرح کہیں گے۔ خالق وحدت ہے تو مخلوق کثرت ہے، خالق بے نیاز ہے تو مخلوق محتاج ہے، خالق باپ نہیں رکھتا تو مخلوق باپ رکھتی ہے۔ خالق کا کوئی بیٹا نہیں لیکن مخلوق کا بیٹا ہوتا ہے، خالق کا کوئی خاندان نہیں لیکن مخلوق کا خاندان ہونا ضروری ہے۔'

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی فرماتے ہیں۔ اگر مخلوق اپنے خالق سے ربط استوار کرنا چاہتی ہے تو ان پانچوں صفات کے حوالے سے وہ فقط اتنا کر سکتی ہے کہ اپنی تمام

Scanned by CamScanner

حاجات کو اس لا احتیاج ذات سے جوڑ لے۔ یعنی اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کو صرف اور صرف اللہ ہی پورا کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ مخلوق جب تک اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کے لئے اپنے جیسی مخلوق کی طرف متوجہ رہتی ہے، اس کا ارتباط اپنے خالق سے نہیں ہو پاتا۔ یعنی اگر کوئی اپنے خالق سے اپنا ربط اور تعلق استوار کرنا اور اُس کو مضبوط بنانا چاہتا ہے، تو اُس کو اپنی ہر احتیاج کے لئے اپنا ذہن اپنے خالق..... اللہ تعالیٰ کی طرف مبذول رکھنے کی عادت کو اپنانا ہوگا۔

ذہن کے اس عمل اور عادت کو علمائے باطن استغنا کا نام دیتے ہیں۔ یہ استغنا اللہ تعالیٰ کی صفتِ صمدیت کا عکس ہے۔ جس انسان کو استغنا کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے، اس کا ذہن ماحول کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ روحانی علوم کے طالب علموں کو انخلائے ذہنی کی مشق اسی لئے کروائی جاتی ہے تا کہ اُن کا ذہن ماحول کے ہجوم سے باہر نکل کر لاشعور کی حدود میں قدم رکھ سکے۔ انسانی ذہن ماحول سے آزادی حاصل کر لینے کے بعد، شعور کی دنیا سے ہٹ کر لاشعور کی دنیا میں داخل ہو سکتا ہے۔

لاشعور کی دنیا میں داخل ہونے، ذہن کو ماحول کی گرفت سے آزادی دلانے کے لئے جو مشقیں کی جاتی ہیں اُن میں مراقبہ کا طریقہ نہایت مجرب اور سہل ہے۔ مراقبہ ایک ایسے تصور کا نام ہے جو آرام دہ نشست میں بیٹھ کر، آنکھیں بند کر کے کیا جاتا ہے۔ مراقبہ کرنے کے دوران، ذہن کو کسی ایک نکتے پر مرکوز کرنے کے بعد اُس کو ڈھیلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ڈھیلا چھوڑنے سے مراد یہ ہے ذہن میں خود اپنی طرف سے کوئی خیال نہ لایا جائے ..... جو خیال آئیں، انہیں آنے دیا جائے۔ ذہن میں آنے والے خیالات سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ نہ کسی خیال کو رد کیا جائے اور نہ ہی کسی خیال میں الجھا جائے۔ اس طرح سے ذہن پر وہ حالت طاری کی جاتی ہے جس کو انخلائے ذہنی یا خالی الذہن ہونا کہتے ہیں۔

جب انسان خالی الذہن ہو جاتا ہے، تو اس کا ذہن کسی جھیل کی ٹھہری ہوئی سطح کی

Scanned by CamScanner

مانند آئینے کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ اس آئینے میں انسان کو جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح کی مانند انفس و آفاق کے نقوش کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔ جیسے ہم کسی جھیل کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی ساکت سطح پر آسمان پر تیرتے بادلوں کا عکس دیکھ سکتے ہیں، یا قدرے زاویہ بدل کر جھیل کی تہہ میں موجود پتھر اور گل بوٹے بھی دیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ جھیل کا پانی صاف شفاف ہو اور اس کی سطح پر لہریں بھی نہ اُٹھ رہی ہوں۔

بالکل اسی طرح جب انسان کے ذہن میں خیال کی اچھلتی لہروں کو قرار آجاتا ہے۔ ان کا بہاؤ تھم سا جاتا ہے، تو انسان اپنے ذہن کی اس ٹھہری ہوئی سطح پر چاہے تو اپنے اندر کی دنیا جس کو قرآن انفس کہتا ہے، یا اپنے لاشعور کی وہ سطح جس کو قرآن آفاق کہتا ہے، دیکھنے لگتا ہے۔ اول اول ایک آدھ جھلک ہی مشاہدے میں آتی ہے۔ لیکن مستقل مزاجی سے مشق کرتے رہنے سے، رفتہ رفتہ طبیعت مانوس ہونے لگتی ہے اور دیکھے ہوئے مناظر ذہن کی گرفت میں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جوں جوں سکت اور رفتار بڑھتی ہے انسان کی قوت مشاہدہ زیادہ بہتر انداز میں کام کرنے لگتی ہے۔ انسان اپنی باطنی دنیا سے واقف ہوتا چلا جاتا ہے۔ جو انسان اپنے باطن سے جس قدر زیادہ واقف ہوتا ہے وہ عرفانِ الٰہی کی منازل اسی قدر بہتر انداز میں طے کرتا ہے۔

حدیث پاک من عرفه نفسهٗ فقد عرفه ربهٗ کا یہی مفہوم ہے کہ جو انسان اپنے اندر کی دنیا کا مشاہدہ رکھتا ہے، اپنے باطن میں اتر کر وہاں کے اسرار کو سمجھنے پر آمادہ و تیار ہے، وہ اپنے رب کی بابت زیادہ بہتر آگہی سے آراستہ ہوتا ہے۔

وہ لوگ جو اپنے باطن سے روشناس اور آگاہ ہوتے ہیں، اُن کے نزدیک سورۃ الاخلاص کے نام کی وجہ تسمیہ یہ بنتی ہے کہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو بھی کام سرانجام دیتا ہے وہ نہایت ہی خلوص اور اخلاص سے کرتا ہے۔ اللہ سے بڑھ کر کوئی ذات مخلص نہیں ہو سکتی۔ اسی بات کی

Scanned by CamScanner

طرف انسانوں کی توجہ کو مبذول کروانے کے لئے اس سورۃ کا نام اخلاص رکھا گیا ہے۔

یہاں سے یہ اصول بھی وضع کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ اپنے اندر، اللہ کی مخلوق کی بابت اخلاص رکھتے ہیں، وہ جو بھی کام کرتے ہیں اُسے مخلص ہو کر سرانجام دیتے ہیں، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور اس بات کی سند زبانِ خلق سے اس بندے کے خلوص کی تعریف اور پسندیدگی کی صورت اس کے سامنے لاتا رہتا ہے۔

Scanned by CamScanner

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ

اللہ تعالٰی نہایت میٹھے اور محبت بھرے انداز میں اپنے بندوں کو ایک راز بتاتا ہے۔ 'تم یاد کرو مجھے، میں یاد کروں تمھیں!'۔ خالق بندوں کا محتاج نہیں، بندے اپنے خالق کے محتاج ہیں۔ اگر اللہ تعالٰی اپنا ذکر برائے ذکر ہی کروانا چاہتا تو اُس کے لئے اِس امر کو حاصل کرنے کے لئے مخلوق کے اندر سانس لینے کی طرح یاد کرنے کا ایک غیر اختیاری نظام جاری کرنا کچھ دشوار نہ تھا۔ لیکن اللہ نے اپنا تذکرہ کرنا مخلوق کے لئے اختیاری بنا دیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی یاد، اپنے تذکرے کے فوائد گنوانے کے ساتھ ساتھ اس کو طرح طرح کے نعامات کا لالچ بھی دیا۔ ان میں ایک نہایت لطیف اور جمیل ترغیب یہ دی کہ تم مجھے یاد کرو گے، تو میں بھی تمھیں یاد کروں گا۔

اس بات پہ غور کیا جائے کہ اللہ تعالٰی اپنا ذکر کئے جانے پہ اتنا اصرار کیوں کرتا ہے؟ ند کا ذکر کرنے سے در حقیقت کیا مراد ہے؟ ذکر کا درست اور صحیح طریقہ کیا ہونا چاہیے؟

کلام پاک میں لفظ' ذکر' ۵۲ مرتبہ اور اس کے مشتق الفاظ ۲۱۳ مرتبہ اس کے علاوہ

Scanned by CamScanner

استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی کل ۲۶۵ مرتبہ ذکر کی تلقین و ترغیب کی گئی ہے۔ اس تلقین و ترغیب کے نتیجے میں ذکر الٰہی سے اطمینان قلب سے لے کر اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو یاد کرنے تک کی برکات کا وعدہ اس پہ مستزاد ہے۔ اردو میں ذکر کرنا کسی کے حوالے سے بات کرنا، تذکرہ کرنا وغیرہ لیا جاتا ہے۔ دینی اصطلاح میں اللہ کی نام کی تسبیح جپنے کو بھی ذکر ہی کہا جاتا ہے۔ اس طرح ورد کے دو طریقے، ذکر جہری اور ذکرِ خفی، معروف و مقبول ہیں۔

قرآن حکیم کے مطابق اپنے فرائض کا ادا کرنا، اپنے ذمے لگے کام کو سرانجام دینا اور اسی میں جتے رہنا تسبیح کہلاتا ہے۔ اس بات کی روشنی میں جب ہم اسمائے الٰہی کی مالا جپنے کے عمل کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سمجھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں رہتا کہ ہمارا عمل قرآن کے اصل مفہوم سے کتنی مطابقت رکھتا ہے۔ اسمائے الٰہی کے ورد اور ان کی مالا جپنے کے فوائد اپنی جگہ لیکن اس عمل کو بھی اگر بے توجہی سے کیا جائے تو اس کے فوائد کی بجائے نقصان کا خدشہ ہوتا ہے۔

ذکر کو درست انداز میں سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات ذہن نشین ہونا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مخلوق کا ربط اور بندھن کیسے اور کس قدر ہوتا ہے۔ خالق کا مخلوق سے ربط اور تعلق ایک بات ہے اور مخلوق کا اپنے خالق سے ربط اور تعلق بالکل دوسری بات ہے۔ ہمارا ہونا، ہمارا زندہ رہنا، اس زندگی کے لئے وسائل کا دستیاب ہونا وغیرہ، یہ باتیں خالق کے اپنی مخلوق سے ربط کی دلیل ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے اپنا رابطہ منقطع کر دے تو مخلوق کا وجود برقرار ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن جب مخلوق اپنے خالق سے اپنا ربط اور تعلق استوار کرتی ہے تو وہ اس غرض و غائیت اور مقصد کو جان لیتی ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے اس کو وجود بخشا ہے۔

اس بات کو برقی آلات کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ گھروں میں بجلی سے چلنے والی کتنی ہی اشیاء استعمال ہوتی ہیں۔ پنکھے، قمقمے، استری، ٹیلیویژن، ریفریجریٹر، ایرکنڈیشنر، ہیٹر، مائکروویو چولہے وغیرہ۔ ان میں ہر چیز کو دو تاروں کی مدد سے بجلی سے جوڑا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تار بجلی کے بہاؤ کو برقی آلات تک لاتی ہے جبکہ دوسری تار سے بجلی ان

Scanned by CamScanner

آلات کو ان کا کام کرنے کی قوت اور توانائی دے کر واپس جاتی ہے۔ کسی بھی برقی آلے کو بجلی کا کنکشن فراہم کرنے کے بعد، یعنی اس کو بجلی کی دونوں تاروں سے جوڑنے کے بعد اگر اس کا سوئچ آن نہ کیا جائے تو بجلی کے بہاؤ کو واپسی کا راستہ نہیں مل سکتا۔ اس سوئچ کے استعمال سے برقی بہاؤ کو واپس جانے کا راستہ فراہم کیا جاتا ہے۔ اس سوئچ کو آن کئے بغیر کوئی برقی آلہ اپنا وجود رکھنے کے باوجود، برقی کرنٹ سے متصل ہونے کے باوجود وہ کام کر ہی نہیں سکتا جس کے لئے اس کو بنایا گیا ہے۔ یعنی اگر وہ ایک پنکھا ہے تو وہ اس وقت تک ہوا دینے سے قاصر ہی رہے گا جب تک اس کا سوئچ آن نہ کیا جائے۔

بعینہٖ مخلوق کو اپنی وجہ تخلیق سے عہدہ برآ ہونے کے لئے خالق سے دوررویہ ربط و تعلق قائم کرنا ضروری ہے ورنہ مخلوق اپنا مقصد تخلیق پورا نہیں کر سکتی۔ اب خالق نے اپنے کسی منصوبے کے مطابق، کسی مقصد کے تحت، مخلوق سے کوئی کام لینے کو، اسے وجود بخشا۔ اس کے بعد اُس کو اپنا کام سرانجام دینے کے لئے درکار توانائی کے لئے، خود اپنی طاقت اور انرجی اُس کو فراہم کرنے کا ایک نظام بھی وضع کر دیا۔ لیکن مخلوق اپنے اندر نصب سوئچ کو استعمال ہی نہ کرے تو وہ نہ کسی قمقمے کی طرح روشن ہو سکتی ہے اور نہ کسی استری کی طرح گرم اور نہ ہی کسی پنکھے کی طرح ہوا دے کر دوسروں کو راحت پہنچا سکتی ہے۔

اب اگر مخلوق میں اس سوئچ کو سمجھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی توجہ ہی وہ سوئچ ہے، جس سے انسان کا تعلق اپنے منبع تخلیق سے جڑ جاتا ہے۔ جب انسان اپنی توجہ اللہ کی طرف مبذول، مرکوز و مرتکز کر لیتا ہے تو اس کے اندر نصب 'سوئچ' آن ہو جاتا ہے اور خالق کی طرف سے آنے والی توانائی کے بہاؤ کو واپسی کی راہ مل جاتی ہے۔ جونہی سرکٹ مکمل ہوتا ہے، انسان کسی برقی آلے کی مانند اپنا وہ کام سرانجام دینے لگتا ہے، جس کے لئے اس کے خالق نے اس کو وجود بخشا ہوتا ہے۔ جب تک انسان اپنے خالق، اپنے رب، اپنے مالک اللہ رحمٰن و رحیم کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اس کے اندر نصب سرکٹ نامکمل رہتا ہے۔ نامکمل

Scanned by CamScanner

سرکٹ کی وجہ سے اس کا وجود کسی بے کار برقی آلے کی طرح کسی کام نہیں آتا۔

تمام روحانی اسباق، دینی اور مذہبی فرائض کے پیچھے یہی حکمت کارفرما ہے کہ انسان کی توجہ اللہ جل جلالہٗ کی طرف مبذول رہے۔ اس توجہ کو اللہ کی طرف مرکوز اور مرتکز کرنے کے لئے انسان کو کلامِ الٰہی کی تلاوت سے لے کر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پہ غور و فکر کرنے اور ذکر الٰہی سے لے کر صوم صلوٰۃ، حج زکوٰۃ تک مختلف اور متفرق راستے اور طریقے بھی طے کر دیئے کہ حضرت انسان کو کوئی دشواری نہ رہے۔ لیکن اب انسان یہ سب طریقے اختیار بھی کر لے لیکن اس کی توجہ پھر بھی اللہ خالقِ کائنات کی بجائے دیگر مخلوقات کی طرف ہی مبذول اور مرتکز رہے.... تو اللہ اُس کو جہنم کی وعید کیوں نہ دے؟

توجہ کے کردار کو سمجھنے کے لئے اس بات کو جاننا ضروری ہے کہ اگر کوئی چیز ہماری توجہ حاصل نہیں کر پاتی تو وہ موجود ہونے کے باوجود ہمارے لئے لاموجود ہی رہتی ہے۔ اگر ہم کسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو اس کا وجود ہمارے لئے معدوم ہی رہتا ہے۔ بیداری کی حالت میں ہمارے اردگرد جو کچھ ہوتا ہے، اگر ہم پوری طرح متوجہ نہ ہوں تو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا ہوا، کس طرح ہوا، کب ہوا اور کیوں ہوا؟ یعنی جب ہمارا ذہن کسی کام یا چیز کی طرف متوجہ ہے تو اُس کی کوئی اہمیت ہے ورنہ اُس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لئے اگر انسان ذکر کرے تو توجہ اس ذکر کا ساتھ دے۔ لیکن اگر ذکر تو ہو لیکن بے توجہی کے ساتھ ہو تو اس کی نہ کوئی اہمیت ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی فائدہ۔

روحانی سائنسدان حضرت تاج الدین بابا اولیاؒ ناگپوری نے فرمایا ہے۔ "اگر نگاہ کے ساتھ فکر کام نہ کرے تو زبان نگاہ کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ نگاہ اور فکر کا عمل ظاہر ہے۔ دراصل سارے کا سارا عمل تفکر ہے۔ نگاہ محض ایک گونگا بہولا ہے۔ فکر ہی کے ذریعے تجربات عمل میں آتے ہیں۔ نگاہ کی طرح دیگر تمام حواس بھی گونگے، بہرے اور اندھے ہیں۔ تفکر ہی حواس کو سماعت اور بصارت دیتا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ حواس تفکر سے الگ کوئی چیز

Scanned by CamScanner

ہے۔ حالانکہ تفکر سے الگ ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انسان محض تفکر ہے، فرشتہ محض تفکر ہے، جن محض تفکر ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر ذی ہوش تفکر ہے۔ انسان پابہ گل ہے، جنات پابہ ہیولیٰ ہیں اور فرشتے پابہ نور۔ یہ تین قسم کے تفکر ہیں"

حضرت باباصاحبؒ کے اس ارشاد ترجمانِ فیض سے فکر اور توجہ کی اہمیت کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ باباصاحبؒ نے یہ بات بھی تعلیم فرمائی۔ "عام زبان میں تفکر کو اَنا کا نام دیا جاتا ہے۔ اور اَنا یا تفکر ایسی کیفیات کا مجموعہ ہوتا ہے جن کو مجموعی طور پر فرد کہتے ہیں۔ اس طرح کی تخلیق ستارے بھی ہیں اور ذرّے بھی۔ ہمارے شعور میں یہ بات یا تو بالکل نہیں آتی یا بہت کم آتی ہے کہ تفکر کے ذریعے ستاروں، ذرّوں اور تمام مخلوقات سے ہمارا تبادلہ خیال ہوتا رہتا ہے۔ اُن کی اَنا یعنی تفکر کی لہریں ہمیں بہت کچھ دیتی ہیں اور ہم سے بہت کچھ لیتی بھی ہیں۔ تمام کائنات اس قسم کے تبادلہ خیال کا ایک خاندان ہے۔ قدرت کا چلن یہ ہے کہ وہ لامتناہی تفکر سے متناہی تفکر کو فیضان پہنچاتی رہتی ہے۔ پوری کائنات میں اگر قدرت کا یہ فیضان جاری نہ ہو تو کائنات کے افراد کا یہ درمیانی رشتہ کٹ جائے۔ ایک تفکر کا دوسرے تفکر کو متاثر کرنا بھی قدرت کے اس طرزِ عمل کا ایک جزو ہے۔"

"مسلسل تفکر اور توجہ دینے سے ذہن کائناتی لاشعور میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہمارے سراپا کا معین پرت اَنا کی گرفت سے آزاد ہو کر ضرورت کے مطابق ہر چیز دیکھتا، سمجھتا اور شعور میں محفوظ کر دیتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ انسان کی فکر کو جلا دینے، اس کے اندر اپنے فیضان کے بہاؤ کو جاری کرنے کے لئے، اُس کو اپنی طرف متوجہ رکھنے کے لئے، اُس کو اپنا ذکر کرنے، خود کو اپنی یاد میں بسانے کا حکم دے رہا ہے۔ جب فیضان کی ایک لہر اللہ کے لامتناہی تفکر سے چل کر انسان کے شعور کو چھوتی ہے اور انسان اس کو اپنی توجہ کے ذریعے محسوس بھی کر لیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس بات کو اپنی یاددہانی یا اپنا ذکر کرنے سے تعبیر کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے اُس کا ذکر ہوتا ہے تو ایک احساس جنم لیتا ہے۔ اس احساس کا ایک تاثر مرتب ہوتا ہے۔ تاثر کی یہ لہر پھیلتی ہے اور واپس لامتناہی تفکر کی طرف پلٹتی ہے۔ لامتناہی

Scanned by CamScanner

تفکر کے اس تاثر کو اپنے اندر سمیٹ لینا دوہرے نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ ایک طرف انسان اپنی تخلیق کے مقصد کو پورا کرنے کے قابل ہوتا ہے اور دوسری طرف اُس کو مزید فیضیاب ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ انسان کا ذکر کئے جانے کی بات سے واضح فرما رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر زبان سے باآواز بلند کیا جائے تو اس کو ذکر جہری اور اگر زیرِ لب یا دل ہی دل میں کیا جائے تو اس کو ذکرِ خفی کہا جاتا ہے۔ اس طرح سے ذکر کرنے سے یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ ذکر کرتے وقت توجہ ذکر کے لئے منتخب کئے گئے اسم کی معنویت کی طرف مرکوز رہے تو اس اسم کے انوار و تجلیات کا عکس انسان کی روح کو سیراب کرنے کا سبب بنتا ہے۔

مثلاً یاحیّ یا قیوم کا ورد کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی صفت حیات اور صفت قیام ورد کرنے والے کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ چونکہ انسان کو اپنی حیات کے قیام کے لئے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کے انسان کی طرف متوجہ ہونے سے حیات کے قیام کے وسائل کا بہاؤ ورد کرنے والے کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کے ان اسماء پہ غور و فکر کے لئے ذہن میں اِن کی تکرار کی جاتی ہے تو یہ ورد کی بجائے ذکر بن جاتا ہے۔ جب انسان کی توجہ ان اسمائے الٰہیہ کی معنویت کی طرف مبذول ہو جاتی ہے، تو ان اسماء کی نورانیت ان اسماء کے تمثلات کو انسانی ذہن پر منکشف کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مد ظلہٗ العالیٰ فرماتے ہیں۔ ''لا متناہی تفکر اور لاشعور ایک دائرہ ہیں جبکہ محدود شعور اور متناہی تفکر مثلث۔ جس فرد پہ مثلث غالب ہو، وہ شعور کی حدود میں مقید رہتا ہے، لیکن جس فرد پہ دائرہ غالب آجاتا ہے تو اس کا شعور محدودیت کے باوجود لامتناہی تفکر سے فیضان پاتا ہے۔ یاحیّ یا قیوم کا ورد کرنے، اس پہ غور و فکر کرنے والے فرد پہ، اِن اسما کی نورانیت کے سبب، حاوی مثلث مغلوب ہو جاتی ہے اور دائرہ غالب آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے وہ فرد پابہ گِل ہوتے ہوئے بھی لامتناہی تفکر سے فیضیاب ہونے لگتا ہے۔''

Scanned by CamScanner

اصحٰب الیمین

کلام پاک میں اصحاب کا لفظ ۷۷ بار استعمال ہوا ہے ان کی تفصیل میں جائیں تو اصحاب النار، اصحاب الجحیم، اصحاب الفیل، اصحاب الیمین، اصحاب المشئمۃ، اصحاب الشمال، اصحاب الجنۃ، اصحاب الرس، اصحاب الاعراف، اصحاب مدین، اصحاب الایکہ، اصحاب السبت، اصحاب الحجر، اصحاب الکہف وغیرہ کے تذکرے کئے گئے ہیں۔

ان میں سے زیادہ تر کے مفہوم کو سمجھنے میں کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی، لیکن سورۃ الواقعہ کے مطالعہ کے دوران اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کی درست انداز میں تفہیم میں ضرور دشواری محسوس ہوتی ہے۔

سورۃ الواقعہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

"جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آئے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا۔ وہ تہ و بالا کر دینے والی آفت ہوگی۔ زمین اُس وقت یک بارگی ہلا ڈالی جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے۔

Scanned by CamScanner

تم لوگ اس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔

اصحاب المیمنہ .....اور اصحاب المیمنہ (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا۔

اور اصحاب المشئمہ ...اور اصحاب المشئمہ (کی بدنصیبی) کا کیا ٹھکانا۔

اور سابقون...وہ تو پھر آگے والے ہی ہیں۔ وہی تو مقرب لوگ ہیں۔ نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے۔ اگلوں میں سے بہت اور پچھلوں میں سے کم۔ مرصع تختوں پر تکیے لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ اُن کی مجلسوں میں ابدی لڑکے شراب چشمہ جاری سے لبریز پیالے اور کنڑ اور ساغر لئے دوڑتے پھرتے ہوں گے جسے پی کر نہ اُن کا سر چکرائے گا نہ اُن کی عقل میں فتور آئے گا۔ اور وہ اُن کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چن لیں، اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں۔ اور ان کے لئے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی، ایسی حسین، جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔ یہ سب کچھ اُن اعمال کی جزا کے طور پر انہیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ وہاں وہ کوئی بے ہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے۔ جو بات بھی ہوگی ٹھیک ٹھیک ہوگی۔

اور اصحاب الیمین، اور اصحاب الیمین کی کیا بات ہے۔ وہ بے خار بیریوں، اور تہہ بہ تہہ چڑھے ہوئے کیلوں، اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہر دم رواں پانی اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں، اور اونچی نشست گاہوں میں ہوں گے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنا دیں گے۔ اپنے شوہروں کی عاشق اور عمر میں ہم سن۔ یہ کچھ اصحاب الیمین کے لئے ہے۔ وہ اگلوں میں بہت اور پچھلوں میں سے بھی بہت ہوں گے۔

اور اصحاب الشمال، اور اصحاب الشمال کا کیا پوچھنا۔ وہ لو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ آرام دہ۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہ عظیم پر اصرار کرتے تھے۔"

Scanned by CamScanner

(آیات ۱ تا ۲۰، سورۃ الواقعہ)

ان آیات پہ غور کیا جائے تو..... پہلی بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ نوع انسانی دراصل تین قسم کے انسانوں پر مشتمل ہے۔

ان تین قسم کے گروہوں کو سابقون یا مقربین، اصحاب المیمنہ یا اصحاب الیمین اور اصحاب المشئمہ یا اصحاب الشمال کہا گیا ہے۔

دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ مقرب لوگوں کو جو ماحول ان کی اگلی زندگی میں میسر ہوگا اس کو نعمتوں بھری جنتیں کہا گیا ہے۔ وہاں ان کے لئے تکیے لگے، سونے کے تخت ہوں گے، جن پر وہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات چیت کریں گے، کمسن لڑکے، ان کے دل پسند، تازہ پھل اور نفیس مشروبات لئے ان کی خدمت کو دوڑے پھریں گے۔ پرندوں کا گوشت اُن کے لئے حاضر رہے گا۔ خوبصورت آنکھوں والی حوریں ان کی دل بستگی کے لئے موجود ہوں گی۔ جبکہ اصحاب الیمین کے لئے جو ماحول دستیاب ہوگا اس میں چھاؤں، اونچی نشست، بہتا پانی، بے خار بیری کے پھل، کیلوں اور دیگر پھلوں کی بہتات ہوگی۔ انکی بیویاں ہم سن، کنواریاں اور ان میں دلچسپی لینے والیاں ہوں گی۔ جبکہ اصحاب الشمال کو دہکتے جہنم کی لُو، کھولتے پانی اور اذیت و کرب کا سامنا ہوگا۔

قرآن کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی انسان اس بات کو سوچے بنا نہیں رہ سکتا کہ یہ سابقون، یمین اور شمال والے لوگ کیا ہیں اور میں خود ان میں سے کون سے گروہ میں سے ہوں گا یا ہونگی؟ قرآنِ حکیم کے جتنے بھی تراجم دستیاب ہیں، ان میں سابقون کو اگلے والے، سبقت لے جانے والے اور پہلے والے بتایا گیا ہے جبکہ اصحاب الیمین کو داہنے والے یا داہنے ہاتھ والے اور اصحاب المشئمہ اور اصحاب الشمال کو بائیں والے یا بائیں ہاتھ والے بیان کیا گیا ہے۔

ان تراجم کی روشنی میں اس بات کو جتنا بھی سوچا جائے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم

Scanned by CamScanner

خود کو کہاں فٹ کریں؟ ہم بہت سے لوگوں کے بعد پیدا ہونے کے باعث اب اگلے والے کیسے اور کیوں کر بن سکتے ہیں؟ اور اگر اس گروہ میں شامل ہونے سے رہ ہی گئے ہیں تو دلہنے والوں میں سے ہیں یا بائیں والوں میں سے۔ اور دائیں اور بائیں والوں سے درحقیقت کیا مراد ہے؟

اگر ہاتھوں کی طرف اشارہ مان لیا جائے تو یہ دونوں ہاتھ تو سب کو ہی عطا کیے گئے ہیں علمائے کرام اس کی یہ توجیہہ بھی دیتے ہیں کہ روزِ حساب جن لوگوں کو ان کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ دائیں والوں کے گروہ میں ہوں گے اور جن کو بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ بائیں والوں کے گروہ میں ہوں گے۔ لیکن اس پر ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر یہ بات نامہ اعمال کے حوالے سے کہی گئی ہے تو پھر سابقون کو ان کا نامہ اعمال ان کے کس ہاتھ میں دیا جائے گا؟ دیا بھی جائے گا یا نہیں؟

اس بات کو اپنے ذہنوں میں واضح کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ جب تک یہ بات واضح نہیں ہوگی ہم کبھی بھی اپنے طرزِ عمل یا طرزِ فکر کو سابقون یا یمین والوں کی طرح نہیں بنا سکیں گے اور نہ ہی شمال والوں کی طرزِ فکر و عمل سے بچ سکیں گے۔ ہم کسی ہدف کو اس وقت تک کسی صورت حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ نشانِ راہ واضح اور غیر مبہم نہ ہو۔ جب ہم یہ جانتے ہی نہیں کہ وہ کیا خصوصیات ہیں جو سابقون کے گروہ میں شامل ہونے کے لئے ضروری ہیں اور کم از کم وہ کیا خصوصیات ہیں جن کو اختیار کئے بغیر دائیں والے گروہ میں شمولیت حاصل نہیں ہو سکتی اور وہ کون سی اہلیتیں ہیں جن کے بغیر ہمیں بائیں والوں میں کھڑا ہونا پڑے گا، تو نہ تو ہم ان کو حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان سے بچ سکتے ہیں۔ کیا محض گناہ عظیم پر اصرار نہ کرنے سے ہم بائیں والوں میں شامل ہونے سے بچ جائیں گے خاص طور پر اس وقت جب ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ قرآن کس بات کو گناہ عظیم کہہ رہا ہے؟

ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر غور و فکر اور سوچ بچار کرنے سے گھبرانے کی بجائے ان باتوں کو دھیان سے سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اس کوشش میں خود اپنی عقل اور قوت

Scanned by CamScanner

فکر کے استعمال کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں سے مدد لینا بھی آجاتا ہے جن کی بابت یہ اندازہ ہو کہ شاید وہ اس کا کوئی ایسا جواب سُجھا سکیں جس کی روشنی میں ہمارے فکر و عمل کی راہیں سابقون یا کم از کم اصحاب یمین جیسے لوگوں کی مانند ہو جائیں۔

آجکل علم اور علمیت نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ آج کا انسان بلا خوف تردید باشعور انسان ہے۔ اس کے شعور میں اب اتنی سکت آچکی ہے کہ وہ درست اور غلط بات میں امتیاز کرنے لگا ہے۔ اسی امتیاز کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جب وہ آسمانی کتب میں دی گئی باتوں کی کوئی مطمعن کر دینے والی توضیح و تشریح نہیں کر پاتا تو وہ ان سے برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اُس کی اِس برگشتگی کو روکنے کا درست اور احسن طریقہ یہی بنتا ہے کہ ہم ہر اُس نکتے پر کھل کر بات کریں، جو کسی بھی طرح ہمارے ذہن کو الجھانے کا سبب ہو یا اس کو اطمینان دینے میں ناکام ہو۔ اس طرح انسان کے شعور میں مزید سکت پیدا ہو سکتی ہے اور وہ اشکال و مسائل کو بہتر انداز میں حل کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔

آجکل علم نفسیات میں انسان کی تلاش و جستجو سے بہت سی باتیں واضح ہو چکی ہیں۔ اُن میں سے ان کی ایک دریافت انسانی دماغ کی کارکردگی کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ نفسیاتی علوم کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان کا دماغ بنیادی طور پر دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان دونوں حصوں کے نام انہوں نے دایاں اور بایاں دماغ رکھے ہیں۔ ان کے مطابق انسان کا دایاں دماغ تخلیقی، وجدانی اور لاشعوری صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے جبکہ بایاں دماغ دائیں دماغ کے برعکس محدود، وجدانی صلاحیتوں سے عاری اور مادی صلاحیتوں کا حامل دماغ مانا گیا ہے۔

جدید آلات کی مدد سے سائنسدانوں نے یہ بات بھی تحقیق کی ہے کہ دماغ اپنی کارکردگی کے دوران الفا، بیٹا، تھیٹا اور ڈیلٹا نام کی لہریں خارج کرتا ہے۔ الیکٹروانسفلوگراف (E.E.G) آلے کی مدد سے یہ بات ان کے مشاہدے میں آچکی ہے کہ انسانی دماغ مختلف

Scanned by CamScanner

حالتوں میں مختلف رفتاروں پہ کام کرتا ہے۔ دماغی کارکردگی کی یہ رفتاریں آدھا سائیکل فی سیکنڈ سے لے کر اکیس بائیس چکر فی سیکنڈ تک ہوتی ہیں۔

بیداری کی حالت میں دماغ چودہ تا اکیس بائیس چکر فی سیکنڈ کی رفتار سے کام کرتا ہے۔ اس رفتار پہ انسانی دماغ کا بایاں حصہ یا بائیں طرف کا دماغ ہی کام کرتا ہے۔ اس رفتار کو (Beta) فریکیونسی کا نام دیا گیا ہے۔ جب دماغ کی اس رفتار میں قدرے ٹھہراؤ آ جاتا ہے اور اس کی رفتار سات تا چودہ چکر فی سیکنڈ رہ جاتی ہے تو انسان کا دایاں دماغ سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔ دماغی کارکردگی کی اس رفتار کو (Alpha) فریکیونسی کا نام دیتے ہیں، جب انسان بہت زیادہ پرسکون ہو جاتا ہے تو انسان کا دایاں دماغ چار تا سات چکر فی سیکنڈ کی رفتار سے کام کرتا ہے۔ اس حالت کو (Theta) فریکیونسی کہا جاتا ہے اور جب یہ فریکیونسی چار چکر فی سیکنڈ سے بھی کم ہو جاتی ہے، تو اس کو (Delta) فریکیونسی کہا جاتا ہے۔

سائنسدانوں نے یہ بات بھی تحقیق کر لی ہے کہ تناؤ، پریشانی، منفی جذبات، تخریبی خیالات، حرص و ہوس وغیرہ سب کے سب بائیں دماغ سے متعلق ہیں۔ سکون، ٹھہراؤ، مثبت سوچیں، تعمیری خیالات، ایثار و قربانی وغیرہ سب دائیں دماغ کی کارکردگی کے نتیجے میں وجود پاتے ہیں۔ شک، بے یقینی، وسوسے اور توہم پرستی جیسی باتیں بائیں دماغ ہی میں آتی ہیں جبکہ یقین، ٹھہراؤ، وجدانی خیالات انسان کا دایاں دماغ ہی موصول کرتا ہے۔ خواب دیکھنے کے وقت بھی انسان کا دایاں دماغ ہی سرگرم عمل ہوتا ہے۔

کچھ عجب نہیں کہ جو بات قرآن حکیم آج سے چودہ صدیاں پیشتر انسان کو سمجھانا چاہتا تھا وہ یہی ہو جو سائنس اپنی ترقی کے سبب آج کسی قدر سمجھ پا رہی ہے۔ اپنے بائیں دماغ کے زیر اثر لوگ نہ صرف خود پریشان رہتے ہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی پریشانی کا موجب بنتے ہیں۔ جب کہ دائیں دماغ کے زیر اثر لوگ خود بھی پرسکون رہتے ہیں اور دوسروں کا بھلا بھی کرتے ہیں۔ اس بات کا انکشاف اور بھی معنی خیز ہو جاتا ہے کہ بیداری میں بایاں اور نیند

Scanned by CamScanner

کے قریب کی حالت میں دایاں دماغ متحرک ہوتا ہے۔ گہری نیند کی حالت میں جب دایاں دماغ اپنی رفتار پر کام کر رہا ہو تو انسان اپنے لاشعور سے ہی متصل ہو جاتا ہے۔

اس بات کی روشنی میں یہ سمجھنا کچھ زیادہ غلط نہ ہوگا کہ اصحاب الشمال یا مشمہ ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو اپنی تمام زندگی بائیں دماغ ہی کے زیر اثر گزار دیتے ہیں اور دنیاوی زندگی میں کبھی اپنے دائیں دماغ کی تحریکات کو عمل نہیں کرنے دیتے۔ اور اصحاب الیمین یا اصحاب المیمنہ ایسے لوگ ہیں جن کی زندگیاں اپنے دائیں دماغ کی تحریکات کے زیر اثر گزرتی ہیں۔

لیکن یہاں وہی سوال پھر اٹھتا ہے کہ اگر دائیں دماغ والے اصحاب الیمین ہیں اور بائیں دماغ والے اصحاب الشمال تو سابقون کون سے لوگ ہو سکتے ہیں؟

اب اس مسئلے کو ایک اور طرح سے حل کرنے کا ایک انداز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ طرز فکر کے لحاظ سے انسان کو کس کس طرح جانچا جا سکتا ہے۔ انسان کی طرز فکر کا جائزہ لیا جائے تو اس کی تین اقسام نظر آتی ہیں۔ منفی، مثبت اور نیوٹرل۔ اس حوالے سے دیکھنے پر محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جن تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے، وہ مثبت طرز فکر کے حامل لوگ، منفی طرز فکر والے اور نیوٹرل انداز نظر و فکر رکھنے والے افراد ہیں۔

اس بات کی روشنی میں یہ بات دل کو لگتی ہے کہ سابقون نیوٹرل طرز فکر کے حامل افراد ہوں، اصحاب الیمین مثبت طرز فکر رکھنے والے اور اصحاب الشمال منفی طرز فکر رکھنے والوں کو کہا گیا ہے۔

اس بات کے طے ہو جانے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ درحقیقت انسان کے طرز فکر کو بہتر بنانے کے لئے بتا رہے ہیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس طرح سے انسان کو اپنی طرز فکر تبدیل کرنے پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔ جب کسی کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کو اپنی طرز فکر کو بہتر بنانا ہے تو اس کے لئے اس سلسلے میں عملی اقدام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو الم، ذالک الکتاب لاریب فیہ سے لے کر والناس تک

Scanned by CamScanner

پورا کلام پاک انسان کی طرزِ فکر و عمل کی اصلاح کرنے والی ایک دستاویز ہی تو ہے۔

اب سورہ الواقعہ کو اس بات کی روشنی میں دوبارہ مطالعہ کیا جائے تو اس سورۃ کی معنویت مزید ابھر آتی ہے اور اس کے مفہوم زندگی سے قریب تر محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اب اس اجنبیت کا احساس بھی کم ہو جاتا ہے جو ان الفاظ کے غیر واضح اور مبہم مفاہیم کے سبب ذہن کو قرآن سے دور رکھنے کا سبب بن رہی تھی۔

اللہ تعالیٰ نیوٹرل طرزِ فکر کے حامل لوگوں کو اپنا مقرب کیوں بناتا ہے؟ اس بات کو سمجھنا کچھ زیادہ دشوار اس لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ غیر جانبدار طرزِ فکر اور زاویہ نظر دونوں ہی خود اللہ تعالیٰ کا وصف اور چلن ہیں اور اگر کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کے کسی وصف اور چلن کو اپناتا ہے تو اُس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ اور کس کو اپنے قرب سے سرفراز فرمائے گا۔

معروف روحانی سکالر اور خانوادہ سلسلہ عظیمیہ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہ العالی، مخلوقِ خدا کی خدمت اور رجوع خلائق سے اللہ کے دوست کہلاتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے اللہ تعالیٰ کے نظامِ تکوین کے کارکنان انہی لوگوں کو بنایا جاتا ہے جو نیوٹرل ذہن کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی وہ ذہن ہے جس کو اولیاء کرام ریاضتوں اور مجاہدوں سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورۃ الواقعہ میں مقرب لوگوں کا تکیے لگے، سونے کے مرصع تختوں پر آمنے سامنے بیٹھنا، اس بات کی سند فراہم کرتا ہے کہ 'سابقون' اللہ کے وہ مقرب بندے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سامنے مرصع سنہری نشستوں پر بٹھاتا ہے اور اُن کو جو نعمتیں دی جائیں گی وہ اصحاب الیمین کو دی جانے والی مراعات سے کہیں زیادہ اعلیٰ درجے کی ہیں۔

سورۃ الواقعہ کے آخری آیات میں اس بات میں تو کوئی شک باقی ہی نہیں رہتا کہ آنے والی زندگی کا دارومدار انسان کی طرزِ فکر اور اس ذہن پر ہوتا ہے جو وہ مرنے سے پہلے اپنا لیتا ہے اور زندگی میں اس پر کاربند بھی رہتا ہے۔

"جس وقت مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم دیکھ رہے ہوتے

Scanned by CamScanner

ہو کہ وہ مر رہا ہے، اس وقت اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اسوقت تمہاری بہ نسبت ہم اُس کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتا۔ پھر وہ مرنے والا اگر مقرّبین میں سے ہو تو اس کے لئے راحت اور عمدہ رزق اور نعمت بھری جنت ہے۔ اور اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہو تو اس کا استقبال یوں ہوتا ہے کہ سلام ہے تجھے، تو اصحاب الیمین میں سے ہے۔ اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں میں سے ہو تو اُس کی تواضع کے لئے کھولتا ہوا پانی اور جہنم میں جھونکا جانا۔ یہ سب کچھ قطعی حق ہے، پس اے نبیؐ اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو"۔ (آیات ۸۳ تا ۹۶، سورۃ الواقعہ)

Scanned by CamScanner

دُخَانُ

قرآن پاک میں ایک سورۃ کا نام دخان رکھا گیا ہے جو اسی سورۃ میں استعمال ہونے والے لفظ دخان بمعنی دھواں کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ عام لغت میں دخان دھویں کو کہا جاتا ہے لیکن علمائے باطن کے نزدیک دھواں نظر آتا ہے لیکن دخان اپنی لطافت کے سبب نظر نہیں آتا۔

دخان کیا ہے؟ تخلیقِ کائنات میں اس کا کردار و اہمیت کیا ہے؟ دخان اور دھویں میں کیا فرق ہے اور کیا قدر مشترک ہے؟ انسانی زندگی سے اس کو کوئی نسبت اور اس کا کوئی ربط ہے یا نہیں؟

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی روشنی میں دخان درحقیقت ہے؟

" آپ کہہ دو، کیا تم منکر ہوتے ہو اُس سے جس نے بنائی زمین دو دن میں اور برابر کرتے ہو اوروں کو اس کے ساتھ؟ وہی تو جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اس نے اسکے اوپر بوجھ رکھے اور اس میں برکت ڈالی اور مقرر کیں مقداریں توانائی کیا اس کے اندر چار دنوں میں تاکہ حاجتمندوں کی ضرورت پوری ہو۔ پھر وہ آسمان کی طرف بڑھا، جو اس وقت دخان

Scanned by CamScanner

کی حالت میں تھا اور کہا۔ اُس سے اور زمین سے، کہ آجاؤ! چاہو یا نہ چاہو۔ وہ بولے ہم آگئے اطاعت گزاروں کی طرح۔"

(سورۃ حم سجدہ: آیت ۹ تا ۱۱)

"اور تو دیکھ کہ کب آسمان دھواں دھواں ہوتا ہے" (الدخان: آیت ۱۰)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد عالی مقام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین اور آسمان کی پیدائش دخان سے کی گئی ہے اور جب یہ اپنی عمر پوری کریں گے تو یہ واپس اسی دخان کی حالت میں آجائیں گے جس میں یہ اپنی پیدائش سے یا وجود میں آنے سے پیشتر تھے۔

دخان کی بابت مزید سوچ بچار سے پیشتر مناسب ہوگا کہ عظیم روحانی سائنسدان حضرت تاج الدین بابا اولیاؒ ناگپوری نے اس بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس پہ ایک نظر ڈال لی جائے۔

آپ نے فرمایا: "کائنات زمانی و مکانی فاصلوں کا نام ہے۔ یہ فاصلے، انا کی چھوٹی بڑی مخلوط لہروں سے بنتے ہیں۔ ان لہروں کا چھوٹا بڑا ہونا ہی تغیر کہلاتا ہے۔ دراصل زمان اور مکاں دونوں اسی تغیر کی صورتیں ہیں۔ دخان جس کے بارے میں دنیا کم جانتی ہے، اس مخلوط کا نتیجہ اور مظہر کی اصل ہے۔ یہاں دخان سے مراد دھواں نہیں ہے۔ دھواں نظر آتا ہے اور دخان ایسا دھواں ہے جو نظر نہیں آتا۔ انسان مثبت دخان کی اور جنات منفی دخان کی پیداوار ہیں۔ رہا فرشتہ تو وہ ان دونوں کے ملخص سے بنا ہے۔

عالمین کے یہ تین اجزائے ترکیبی غیب و شہود کے بانی ہیں۔ ان کے بغیر کائنات کے گوشے امکانی تموج سے خالی رہتے ہیں۔ نتیجہ میں ہمارا شعور اور لاشعور حیات سے دور نابود میں گم ہو جاتا ہے۔ ان تینوں نوعوں کے درمیان عجیب و غریب کرشمہ برسرِ عمل ہے۔

مثبت دخان کی ایک کیفیت کا نام مثاس ہے۔ اس کیفیت کی کثیر مقدار انسانی خون میں گردش کرتی رہتی ہے۔ دخان کی منفی کیفیت نمکین ہے۔ اس کیفیت کی کثیر مقدار جنات

Scanned by CamScanner

میں پائی جاتی ہے۔ان ہی دونوں کیفیتوں سے فرشتے بنے ہیں۔اگر ایک انسان میں دخان کی مثبت کیفیت یعنی مٹھاس کم ہو جائے تو اس انسان میں جنات کی تمام صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور وہ جنات کی طرح عمل کرنے لگتا ہے۔اگر کسی جن میں دخان کی مثبت کیفیت بڑھ جائے اور منفی کیفیت کم ہو جائے تو اُس میں ثقل وزن پیدا ہو جاتا ہے۔فرشتہ پر بھی یہی قانون نافذ ہے۔اگر مثبت اور منفی کیفیات معین سطح سے اوپر آجائیں تو مثبت کے زور پر وہ انسانی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے اور منفی کے زور پر جنات کی۔بالکل اسی طرح اگر انسان میں مثبت اور منفی کیفیات معین سطح سے کم ہو جائیں تو اُس سے فرشتے کے اعمال صادر ہونے لگے گے۔

طریق کار بہت آسان ہے۔مٹھاس اور نمک کی معین مقداریں کم کر کے فرشتوں کی طرح زمانی اور مکانی فاصلوں سے وقتی طور پر آزاد ہو سکتے ہیں۔محض مٹھاس کی مقدار کم کر کے اور نمک کی مقداریں خون میں زیادہ کر کے جنات کی طرح زمانی مکانی فاصلے کم کر سکتے ہیں لیکن ان تدبیروں پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی روحانی انسان کی راہنمائی اشد ضروری ہے۔"

حضور قلندر بابا اولیاؒ نے اپنے ایک شاگرد کو جو اسباق پڑھائے وہ اسباق انہوں نے 'قدرت کی اسپیس' نامی کتاب کی صورت شائع کئے۔اس کتاب میں حضور قلندر بابا فرماتے ہیں کہ دخان اصل میں کاربن سے بُنا ہوا ایک جال ہے جو مادی تخلیقات کی اساس ہے۔قدرت نے اس مقصد کے لئے کاربن کو ہی کیوں چُنا؟ یہ قدرت کا ایک راز ہے۔"

روحانی بزرگوں کی ان باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جب ہم دخان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بات واشگاف ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کاربن کے ایٹموں سے کائناتی مظاہر زمین و آسمان کی تخلیق کا تانا بانا تیار کیا۔انسان اسی زمین کا ایک جزو ہونے کے باعث کاربن کی کثیر مقدار کا حامل ہے۔کاربن سے تیار ہونے والی مٹھاس انسان کی خوراک کا جزو

Scanned by CamScanner

اعظم ہے۔ سائنسی زبان میں اس کو کاربوہائیڈریٹ کہا جاتا ہے۔ گلوکوز، گلائیکوجن اسی کاربوہائیڈریٹ یعنی نشاستے ہی سے تشکیل پاتے ہیں۔ اسی طرح جب انسان سانس لیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر آکسیجن خون میں شامل ہو کر نشاستے کے مرکبات کو جلاتی ہے۔ نشاستے کے جلنے سے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس بنتی ہے۔ اب اگر انسان کے خون میں کاربن کا ذخیرہ نہ ہو تو کاربن ڈائی آکسائیڈ کیسے بن سکتی ہے؟ اسی طرح دیکھا جائے تو نمکیات کی کیمیائی ترکیب میں کاربن کا عمل دخل نہیں ہوتا یا اگر کہیں ہوتا بھی ہے تو بہت ہی کم۔

یہاں سے ایک اور بات یہ بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کے ماننے والوں کو روزے رکھنے کی تلقین کیوں کی؟ اسلام میں ماہ رمضان ماہ صیام کہلاتا ہے۔ صوم کا یہ پروگرام درحقیقت انسان کے اندر نمک اور مٹھاس کی مقداروں کو ایک ایسی سطح پر لانے کا پروگرام ہے جس کے نتیجے میں انسان کے اندر ملائکیت ابھر آتی ہے۔ نمک اور مٹھاس کی مقداروں کی کمی سے انسان کے حواس کا ثقل کم ہو جاتا ہے اور ان کی رفتار فرشتوں کے اندر کام کرنے والی رفتاروں کے قریب ہو جاتی ہیں۔ لیلۃ القدر کو ماہ صیام کے آخری عشرے میں تلاش کیے جانے کی ہدایت کے پس پردہ حکمت یہی ہے۔ کیونکہ حواس کی رفتار کو بڑھانے میں نمک اور مٹھاس کی مقداروں کی خون میں کمی کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

اس سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ روزے کی جزا میں خود ہوں۔ اس بات کا یہی مطلب بنتا ہے کہ ماہ صیام کے پروگرام پہ عمل کے نتیجے میں انسان کے اندر اُس کے حواس اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ زمانی اور مکانی فاصلوں کی نفی کر کے تجلی الٰہی کے دیدار سے مشرف ہو سکتا ہے۔ سورۃ القدر میں ملائکہ اور روح کے تنزل کا تذکرہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے، ورنہ کیا فرشتے اور روح ہر وقت اور ہمہ وقت ہی نازل نہیں ہوتے رہتے؟

Scanned by CamScanner

اس سے یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ لوگوں کا اتنی بڑی تعداد میں روزے رکھنے کے باوجود اس پروگرام میں کامیابی کا تناسب اس قدر کم کیوں ہے۔ جب انسان روزہ تو رکھے لیکن سحری اور افطار میں نمکین اور میٹھی چیزیں اسقدر استعمال کر لیتا ہے کہ دن بھر میں خوراک نہ کھانے سے جو کمی ہوئی ہوتی ہے، نہ صرف یہ کہ وہ پوری ہو جاتی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ مزید ذخیرہ کر لی جائے تو حواس کا ثقل اور وزن کیونکر کم ہوگا۔

یہاں اس بات کی مزید وضاحت ہونا بھی ضروری ہے کہ حواس کی رفتار کو محض نمک اور مٹھاس کی مقداروں کی کمی سے ہی نہیں بڑھایا جا سکتا بلکہ نیند کی کمی اور زیادہ وقت بیدار رہنے سے بھی حواس کی رفتاریں بڑھتی ہیں۔

قرآن پاک کی سورۃ المزمل میں قیام الیل کی اسی حکمت کی وضاحت کی گئی ہے۔ جب انسان راتوں کو جاگتا ہے اور اپنی نیند کم کرتا ہے، تو اس کے حواس کی رفتاریں بڑھتی ہیں، ایسے میں قرآن حکیم کو ٹھہر ٹھہر کر، رک رک کر پڑھنے سے، زبان اور دل کا تال میل بڑھتا ہے اور اس کے معنی اور مفاہیم کا زیادہ بہتر اور گہرا ادراک نصیب ہو سکتا ہے۔

Scanned by CamScanner

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ

قرآنِ پاک میں تسخیرِ کائنات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے ارشادات بہت ہی واضح اور واشگاف ہیں۔ سورۃ النحل میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

ترجمہ: اور مسخر کیا دن اور رات کو تمہارے لئے اور سورج اور چاند اور تارے مسخر ہیں اُس کے حکم سے۔ اس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔

اس آیت کریمہ پہ غور کیا جائے۔ ان آیات کو بھی نظر میں رکھا جائے جہاں جہاں لیل و نہار کو مسخر کرنے کی بابت ارشاد فرمایا گیا ہے، تو اس بابت ذہن میں یہ سوال اٹھتے ہیں کہ دن اور رات کو مسخر کئے جانے سے کیا مراد ہے؟ یہ سورج چاند تارے اسکے حکم سے مسخر ہیں تو کس کے لئے؟ اگر ہمارے کہنے سے دن کے وقت کو رات میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا یا رات کے وقت کو دن میں مقلب نہیں کیا جا سکتا تو پھر اللہ تعالیٰ یہ بات کس سے فرما رہا ہے کہ

Scanned by CamScanner

تمہارے لئے دن اور رات کو مسخر کر دیا گیا ہے؟ ان باتوں میں عقل رکھنے والوں کے لئے کیا نشانیاں رکھی گئی ہیں اور اُن نشانیوں سے کن کن باتوں کا سراغ لینا منشائے ایزدی ہے؟

ہمارا عملی مشاہدہ ہے کہ ہم دن اور رات کے محکوم ہیں، سورج، چاند اور تارے اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں اور ان کی گردش، اُن کی کارگزاری سے ہمارا محض اتنا ہی تعلق ہے کہ اگر سورج ہمیں روشنی فراہم کرتا ہے تو ہم دھوپ سے استفادہ کر لیتے ہیں، اگر چاند نکلا ہو اور فضا چاندنی سے معمور ہو تو ہم اس کی روشنی سے محظوظ ہو لیتے ہیں۔ ان سے استفادے میں ایسی کیا بات ہے، جن کو ہم اپنے لئے تسخیر ہونا کہہ سکیں؟ کیا جمادات، نباتات اور حیوانات رات کو آرام نہیں کرتے، دن کو تلاش معاش نہیں کرتے، چاند اور سورج کی روشنی، دھوپ اور چاندنی سے استفادے سے محروم رہتے ہیں؟ ان باتوں کا جواب تو یہی بنتا ہے کہ ہم کو لیل و نہار، شمس و قمر اور نجوم پر کوئی تصرف یا کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اب اس جواب کی روشنی میں جب ہم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد عالی مقام کا جائزہ لیتے ہیں کہ تمہارے لئے لیل و نہار کو مسخر کر دیا گیا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اصل بات کیا ہے؟

اس بات کو سمجھنے میں ہمیں جو دشواری یا مغالطہ درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ ہم لیل کو غروب آفتاب کے بعد چھا جانے والی تاریکی، نہار کو طلوع آفتاب کے بعد ہونے والی روشنی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ مغالطہ اسی وقت دور ہو سکتا ہے کہ جب ہم یہ بات ماننے پر آمادہ ہوں کہ قرآن پاک میں لیل سے مراد وہ حواس ہیں جو رات کے وقت مخلوق پر طاری ہوتے ہیں اور نہار سے مراد وہ حواس ہیں جن سے ہمیں بیداری کے دوران سابقہ رہتا ہے۔

اصل بات کچھ یوں ہے کہ حواس تو ایک ہی ہیں محض ان کی رفتاروں میں تغیر واقع ہوتا رہتا ہے اس تغیر کو لیل اور نہار کہا گیا ہے۔ دن کے حواس، جن کو بیداری کے حواس بھی کہا جاتا ہے، کی رفتار رات کے حواس کی رفتار کی نسبت بہت کم ہوتی ہے۔ جب حواس کی رفتار کم

Scanned by CamScanner

ہوتی ہے تو شعور اُن سے استفادہ کرتا ہے لیکن جب ان کی رفتار بڑھ جاتی ہے اور یہ رات یا خواب کے حواس بن جاتے ہیں تو شعور ان کی فراہم کردہ اطلاعات سے استفادے سے، اپنی سکت کی کمزوری کے سبب، عاجز رہ جاتا ہے۔

اگر شعور کی کمزوری کو دور کر لیا جائے اور اس کی سکت بڑھا لی جائے، تو شعور رات کے حواس کا ساتھ دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جب انسان کے شعور کی سکت اور توانائی بڑھتی ہے تو وہ خواب کے حواس کی رفتار کا ساتھ دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا اصل مفہوم یہی ہے کہ انسان کو اپنے حواس کی رفتار کو کم یا زیادہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اسی بات کو لیل و نہار کا مسخر ہونا قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ جب انسان کو اپنے حواس کی رفتار پہ کنٹرول حاصل ہو جاتا ہے تو وہ جب چاہے بیداری میں بھی خواب کے حواس کا استعمال کرتے ہوئے زمانی اور مکانی فاصلوں کی نفی کر سکتا ہے۔

آیت کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شمس و قمر اور نجوم کو اس کے امر سے مسخر کر دیا گیا ہے۔ کس کے لئے؟ اس بات کی کوئی صراحت نہیں کی گئی۔ اس لئے کہ یہ بات از خود سمجھنے کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جس کو خطاب کیا جا رہا ہے اس کے لئے، اُن کو مسخر کیا گیا ہو۔ حضور نبی کریم ﷺ کے معجزہ شق القمر، سورج کو پلٹانے اور ایک نجومی کی فرمائش پر ایک مخصوص ستارے کو لاکھوں سال کی مسافت کی دوری سے پلک جھپکنے میں بلانے، اس کو اپنے سر کے اوپر ایستادہ کر کے، اپنے پیر تلے رکھی چٹان کو موم کر دینے کے بعد اس کو واپس کرنے کے واقعات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ اختیار عطا کیا تھا اور آپ نے اس اختیار کو استعمال کر کے ان علوم کو عملی طور پر برت کر بھی دکھا دیا۔

ان تسخیری علوم اور ان علوم کے تحت حاصل ہونے والے اختیار کے میکانزم کو علمی طور پر سمجھنے اور جاننے کی کوشش سے اجتناب کی کوئی گنجائش اس لئے باقی نہیں رہتی کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو اپنی نشانیاں قرار دے کر ہمیں اپنی عقل کے استعمال کا حکم دے رہا ہے۔

Scanned by CamScanner

اس بات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم نجم وقمر اور شمس کی اصطلاحات کو ان مادی چاند سورج اور ستاروں کے مفہوم سے بالاتر ہو کر سمجھنے کی کوشش کریں۔

انسان کی روح کی ساخت کی بابت علمائے باطن بتاتے ہیں کہ روح اوپر تلے رکھے تین اوراق کی مانند ہے۔ یہ تینوں اوراق آپس میں منسلک اور متصل ہیں۔ روح کے ان تینوں حصوں کو روح حیوانی، روح انسانی اور روح اعظم کہا جاتا ہے۔ روح حیوانی کی سطح پر انسان اپنی زندگی حیوانات کی طرح گزارتا ہے۔ وہ کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا جاگتا ہے، شادی کرتا ہے، گھر بناتا ہے، اولاد پیدا کرتا اور اس کی پرورش کرتا ہے، غصہ کرتا اور لڑتا جھگڑتا ہے۔ روح انسانی کی سطح پر انسان ایسے کام کرتا ہے جو حیوانات نہیں کر سکتے۔ ہتھیار اور اوزار بنانے سے لے کر شعر و شاعری کرنے، ادب اور آرٹ کے شاہکار تخلیق کرنا جیسے سب کام روح انسانی سے صادر ہو کر مظہر بنتے ہیں۔ روح اعظم کی سطح پر انسان اپنے رب کا اطاعت گزار، خلیفۃ الارض، مسجود ملائک اور خادم مخلوق ہوتا ہے۔

ہر انسان ہوش سنبھالنے کے بعد روح حیوانی کی سطح پر ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے شعور، علم و آگہی کو ترقی دیتا ہے اور اپنے طرز فکر میں وسعت اور پھیلاؤ پیدا کر لیتا ہے تو وہ ترقی کر کے روح انسانی کی سطح کو پا لیتا ہے ورنہ اس کی زندگی روح حیوانی کی سطح پر ہی گزرتی رہتی ہے۔

اگر انسان روح حیوانی کی سطح سے ترقی کر کے روح انسانی کی سطح کو پا لیتا ہے تو اس کی زندگی انسانی اقدار کے مطابق اور حیوانی سطح سے بلند ہو جاتی ہے۔ اب اگر انسان اپنی روحانی ترقی کی طرف متوجہ رہتا ہے اور اپنے شعور کو بڑھانے، پھیلانے اور اس کو ترقی دینے میں کوشاں رہتا ہے اور روح اعظم کی سطح پر پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اُن علوم سے نوازتا ہے جن کو علم الاسما کہا جاتا ہے۔

اپنی روح کے ان درجات سے آگاہی اور وقوف کے لئے انسان کو اپنے انفس یعنی باطنی دنیا میں اترنا سیکھنا پڑتا ہے۔ جو بندہ اپنے اندر کی دنیا کا وقوف اور مشاہدہ کر لیتا ہے،

Scanned by CamScanner

اللہ تعالیٰ اس کو ایسے نشانِ راہ دکھا دیتا ہے جس کی مدد سے وہ قدم قدم چل کر اپنے رب، اپنے خالق کا عرفان حاصل کر لیتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم نے ستارہ چاند اور سورج دیکھ کر یہ سوچا کہ شاید یہ میرے رب ہیں لیکن اُن کے غروب ہو جانے پر انہوں نے جان لیا کہ وہ ان کے رب نہیں ہو سکتے کیونکہ اُن کو وجدانی طور پر اس بات کا علم حاصل تھا کہ ڈوب جانے اور اُن سے الگ ہو جانے والا اُن کا رب نہیں ہو سکتا۔ اس واقعے کی بابت علمائے باطن کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ مشاہدات تلاشِ حق کے سفر کے دوران ہوئے تھے۔ جب انہوں نے ستارہ دیکھا تھا تو دراصل انہوں نے اپنی روح حیوانی کو ستارے کے روپ میں دیکھا تھا، جب انہوں نے روشن چاند کو دیکھا تھا تو دراصل انہوں نے اپنی روح انسانی کا مشاہدہ کیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے روح اعظم کا مشاہدہ چمکتے سورج کی صورت میں کیا تھا۔

اس بات کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کیا حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زندگی میں اس سے پیشتر کبھی ستارہ، چاند یا سورج نہیں دیکھے تھے؟ اور پھر انہوں نے محض ایک ہی ستارے کو اپنے رب ہونے پر کیوں قیاس کیا؟ انہوں نے تمام ستاروں کی بابت ایسا کیوں نہیں سوچا؟

اس سے یہ بات سمجھنا غلط نہیں ہوگا کہ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کے مشاہدات درحقیقت ان کے وہ مشاہدات ہیں جو انہیں اپنے باطن کی دنیا میں ہوئے۔ اور ان کے وجدان نے اُن کو یہ بات سوجھائی کہ چھپنے اور غروب ہونے والا اُن کا رب ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ رب انسان سے جدا ہوتا ہی نہیں۔ اگر انسان کا رب اس سے جدا ہو جائے تو انسان باقی کیسے رہ سکتا ہے؟ یہ بات بہت دھیان سے ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انسان کے اندر اللہ کی پھونکی ہوئی روح کام کر رہی ہے اور انسان اس روح کے بغیر اس دنیا میں آنے سے پہلے،

Scanned by CamScanner

اس دنیا میں آنے کے بعد اور اس دنیا سے جانے کے بعد بھی اسی روح کے ساتھ قیام پذیر رہتا ہے۔

اس توجیہہ کی روشنی میں اگر ستارے کو روح حیوانی، چاند کو روح انسانی اور سورج کو روح اعظم کی تمثیل مان لیا جائے تو آیت کے اس حصے کو سمجھنے میں کوئی مغالطہ باقی نہیں رہتا۔ یعنی آیت کے اس حصے میں اللہ تعالیٰ انسان کو یہ بات سمجھاتا ہے کہ انسان کے لئے اپنی روح کے تینوں شعبوں سے استفادہ کرنے، ان سطحوں پر موجود صلاحیتوں اور خصوصیات کو استعمال میں لانے کا اختیار اُس کو دیا گیا ہے۔

اگر انسان اپنی روح کے ان تینوں شعبوں کا وقوف حاصل کرنے کے بعد ان شعبوں سے متعلق صلاحیتوں کو خود میں اجاگر کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علوم کو اپنے، اپنی نوع اور دیگر مخلوقات کے فائدے اور بھلے کے لئے استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کا اہل ہو سکتا ہے، ورنہ تو ہر جاندار اپنے حصے کی زندگی بسر کر ہی لیتا ہے۔

جو لوگ اپنی روح سے واقف ہو سکے انہوں نے اللہ کی مخلوق کے دلوں کو مسخر کیا۔ انہوں نے تسخیری فارمولوں سے واقفیت کو لوگوں پہ اپنے علم کی دھاک بٹھانے اور انہیں اپنے سامنے جھکانے کی بجائے اِن علوم کو اللہ کی مخلوق کی خدمت میں صرف کیا۔ جب تک کوئی خدمت صلہ و ستائش کی تمنا کے لئے کی جاتی ہے وہ خدمت نہیں کہلاتی اللہ کے نزدیک وہ کاروبار ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ کاروبار میں ہمیشہ فائدہ ہی ہو۔

جب تک کوئی انسان اللہ کے کلام میں مستور تسخیری فارمولوں کو اس لئے کھوجتا ہے کہ وہ اُن کو اپنے مفاد کی خاطر برت سکے اس وقت تک اس کی بصارت پر پڑے مفاد اور مصلحت کے پردے اس کو اصل بات دیکھنے اور انہیں سمجھنے میں آڑے رہتے ہیں۔ یہ علوم صرف ایسے لوگوں کو عطا ہوتے ہیں جو انبیا کی طرز فکر سے خود کو آراستہ کر کے خود کو ان علوم کا اہل ثابت کر لیتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ

قرآن پاک پہ غور وفکر کے حوالے سے جو معروضات آپ نے مطالعہ فرمائی ہیں، وہ کسی بھی طور قرآن حکیم کا مفہوم سمجھنے سمجھانے کے ذیل میں حرف آخر نہیں ہیں۔ اس کتاب میں قرآن کے حروف، الفاظ، آیات اور قرآن میں مذکور واقعات پہ غور وفکر کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ کسی بھی بات کی کنہ تک پہنچنے کی ایک طالب علمانہ کاوش ہے اور اس کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کا مقصد فقط اتنا ہے کہ تلاش حق کے کسی جویا کو ان راہوں پر سفر کرنے والے ایک ساتھی کے تجربات سے کچھ سیکھنے کا موقع مل سکے۔

یاد رکھیں جو بات خود غور کرنے پر سمجھ آتی ہے، وہی یاد بھی رہتی ہے اور اس پہ عمل بھی ہوتا ہے۔ محض سنی ہوئی یا بتائی گئی بات اول تو زیادہ دیر حافظے میں نہیں رہتی اور اگر رہ بھی جائے تو اس پہ عمل نہیں ہو پاتا۔ قرآن حکیم کوئی نظریاتی یا ادبی دستاویز نہیں ہے جس پہ محض وقت گزاری کے لئے بات کی جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کی راہنمائی کی آخری اور حتمی دستاویز ہونے کے ناطے بہت زیادہ توجہ کی طالب ہے۔ جتنی توجہ ہم اسے

Scanned by CamScanner

دے رہے ہیں، اُس سے بہرحال زیادہ توجہ دیئے بغیر ہم اس کے فیوض و برکات سے ہرگز استفادہ نہیں کر سکتے۔

اس عاجز کی اپنے محترم قارئین سے صرف اتنی سی استدعا ہے کہ وہ قرآن کو سمجھنے کا ذوق اپنے اندر جتنا بھی زیادہ بڑھا سکتے ہوں ضرور بڑھائیں۔ باقی رہا اس کے سمجھنے سمجھانے کا معاملہ، تو وہ اُسی کے ہاتھ میں ہے جو اس کتاب کا اتارنے والا: اس کا محافظ اور اس کے مفاہیم کا اصل مالک ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو اُس کی راہ میں کوشش کرتے ہیں وہ اُن کی مدد فرماتا ہے اور اُن کے لئے اپنی راہیں کھول دیتا ہے۔ آپ بھی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور نوازے گا۔

اللہ تعالیٰ آپ کا حامی اور ناصر ہو!

Scanned by CamScanner

یادداشت

Scanned by CamScanner

مصنف کی دیگر اردو تصانیف

1۔	ایک سفر اپنے مراد کے ہمراہ	(گلیکسی گرافکس پشاور)
2۔	باتیں میرے مراد کی	(گلیکسی گرافکس پشاور)
3۔	کرومو پیتھی	(گلیکسی گرافکس پشاور)
4۔	قرآن حکیم اور لاشعور	(گلیکسی گرافکس پشاور)
5۔	شعور نے لاشعور سے کہا	(الکتاب پبلشرز کراچی)
6۔	ہمارا نظام تعلیم	نیز سنز ایجوکیشنل پرنٹرز، اردو بازار۔لاہور

ناشرین

برخیا ایجوکیشن فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ)

2680۔لالہ ایوب لین۔پشاور صدر فون نمبر: 091-5272423

Scanned by CamScanner

ALSO BY THE AUTHOR

- Loh-o-Qalum (Pen and the Scripturum) *Translation from Urdu*, 1990, Al-Kitab Publications, Karachi.

- Lectures on Parapsychology, *Translation from Urdu*, 1992, Al-Kitab Publications, Karachi.

- Qalander Conscious, *Translation from Urdu*, 1990. Al-Kitab Publications, Karachi.

- Learn Telepathy, *Translation from Urdu*, 1992. Al-Kitab Publications, Karachi.

- Spiritual Healing, *Translation from Urdu*, 2001, Al-Kitab Publications, Karachi.

- Theory of Chromalucis, *Translation from Urdu*, 2001. Al-Kitab Publications, Karachi.

- Lectures on Loh-o-Qalum, *Translation from Urdu*, 2002 Published by Al-Kitab Publications, Karachi in collaboration with Healing Center Manchester England

- *Aik Safar Apnay Murad Kay Hamrah*, (An account of a journey with the mentor), authored in Urdu, 1998. Maktaba-e-Azeemia, Lahore.

- Chromopathy, authored in Urdu/English, June 2000. Published by the Institute of Chromopathy, Peshawar.

- More than Fifty articles on Parapsychology and Spiritual Science, Published in the daily Frontier Post, Peshawar, on weekly basis, 1990-1992

- Series of articles, *Shaʻur Nay Lashaʻur say Kaha*, (The Conscious tells the Unconscious) appearing in monthly Rohani Digest, Karachi, From June 1997 to September 1999.

Scanned by CamScanner

BOOKS ON SPIRITUALISM

Translated By: Dr.Maqsood Azeemi

Available at all Book Stores

LOH-O-QALUM

By Qalander Baba Aaliya

The most Comprehensive document ever produced on the subject. Detailed study of Creative Formulae governing the micro and macro co'smea.

Rs. 200/=

QALANDER CONSCIOUS

By Khwaja Shamsuddin Azeemi

A book which can enable us to explore extra-terrestrial realms and guide us on the paths of spiritualism

Rs.40/=

LEARN TELEPATHY

By Khwaja Shamsuddin Azeemi

To teach the fabulous science of thought communication this book has been based upon spiritual principles and electro-magnetic formulae.

Rs. 50/=

LECTURES ON PARAPSYCHOLOGY

By Khwaja Shamsuddin Azeemi

Author of this book, a mission oriented Person, is striving hard to spread the teachings of Holy Prophet (PBUH) in modern and scientific manner. This collection reflects his successful efforts to equip us with insight and vision needed to cognise our Lord Creator.

Rs.65/=

It is delightfully announced that these English Versions are Now also available in Pakistan.

Published By:

AL-KITAB PUBLICATIONS

1 K-5, Ashraf Mansion, Nazimabad No 1, P.O. Box: 2222
Karachi-74600, Ph: (92-21) 626433, E-mail: salam_arif@yahoo.com

Scanned by CamScanner

خانقاہی نظامِ تعلیم میں سالکین اور طالبانِ راہ سلوک اپنی تربیت اور تزکیہ نفس کے لئے
روحانی استاذ کی طرزِ فکر سے فیضیاب ہونے کو بنیادی اہمیت کا حامل گردانتے ہیں

ایک سفر

اپنے مراد کے

ہمراہ

نامی کتاب میں مصنف جناب مقصود الحسن عظیمی نے
عصر حاضر کے عظیم روحانی سکالر اور استاذ کے اندازِ تربیت
کو اجاگر کرنے کو ان کے ساتھ بتائے چند روز و سفر کی
روئیداد قلمبند کی ہے۔
اپنی طرزِ فکر کی اصلاح کے خواستگاروں
کے لئے ایک نادر تحفہ

مکتبہ عظیمیہ

ملنے کا پتہ
۱۵۸۔ مین بازار، مزنگ، لاہور

Scanned by CamScanner

نظامِ تعلیم کے بنیادی مقاصد

افکار میں ترتیب، رجحانات میں توازن اور نظریات
میں اعتدال کی اہمیت کو پہلی مرتبہ اجاگر کرتے ہوئے

ڈاکٹر مقصود عظیمی

نے

میں تعلیمی و تدریسی نظام کو درپیش مسائل کے
سہل اور قابلِ عمل حل تجویز کئے ہیں۔

ناشرین

برخیا ایجوکیشن فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ)

2680۔لالہ ایوب لین۔پشاور صدر فون نمبر:5272423

Scanned by CamScanner

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ہم نے پیش کی اپنی امانت سماوات، زمین اور جبال کو، انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا..... لیکن انسان نے اس کو اٹھالیا بیشک انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے۔"

انسان نے اللہ تعالیٰ کی پیش کردہ امانت کو قبول تو کیا لیکن اس کا حق ادا کرنے کو، اسے سمجھنے کے لئے، اس پہ غور و فکر سے کترا تا رہا ہے۔ انسان کی اسی ادا کو اللہ تعالیٰ ظلم اور جہالت قرار دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس عطا کو کہنے کو ہم نسخہ، کیمیا کہتے ہیں۔ اس نسخہ، کیمیا کے ماننے والوں کی تعداد آج ایک ارب افراد سے تجاوز کر چکی ہے۔ اِس تعداد کا عشرِ عشیر بھی اگر اس نسخہ، کیمیا کو غیر جانبداری سے سمجھ لے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان کسی دوسری قوم سے کم تر رہ جائیں۔

برخیا ایجوکیشن فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ) پشاور
فون نمبر: 091-5272423

Scanned by CamScanner